(رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰)
(رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۹۵۰)

جلد (۷) عدد (۴)
شوال المکرم ۱۳۵۴ھ

۶ہ

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ؍

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

فہرست مضامین

ماہ شوال ۱۳۵۴ھ جلد ۷ عدد ۴

اشارات — ابو الاعلیٰ مودودی — ۱۴۲

مقالات:-

قرآن مجید کا رسم الخط — جناب مولانا عبد القدیر صدیقی — ۲۵۵

انسانیت کی تقسیم کے چند مختلف پہلو — جناب مولانا مناظر احسن گیلانی — ۲۶۲

حقوق الزوجین — ابو الاعلیٰ مودودی — ۲۶۹

تنزیل و تاویل:-

تفسیر سورۂ کوثر (علامہ فراہی) — ترجمہ جناب مولانا امین احسن اصلاحی — ۲۸۸

تفسیر سورۃ النصر — جناب مولانا عبد القدیر صدیقی — ۳۰۳

رسائل و مسائل:-

سود، پردہ، طلاق اور مہر — ابو الاعلیٰ مودودی — ۳۰۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسان نے خود اپنی تلاش و جستجو سے جتنے طریقے یا مذاہب ایجاد کیے ہیں ان سب کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ان مذاہب کی ہے جو تخیل کی بلند پروازیوں سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان کی حجوبہ پسندی کو اپیل کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان طریقوں کی ہے جو خواہشات اور اہوائے نفس سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان کے حواس کو اپیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں قسم کے طریقوں میں عقل اور استعداد علمی سے کام لیا گیا ہے، لیکن عقل نہ ان کی محرک ہے، نہ وہ عقل کو اپیل کرتے ہیں، نہ عقلی نتائج کا حصول ان کا منتہائے مقصود ہے۔ عقل اور استعداد علمی ان کے پاس محض ایک آلہ کے طور پر ہے جس سے وہ ادنیٰ درجہ کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کام لیتے ہیں۔ ایک عالم مادی سے قطع نظر کر کے عالم باطنی کی طرف توجہ کرتا ہے اور علم و عقل کی تمام قوتوں کو ایسے ذرائع دریافت کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جن سے وہ نفس کی باطنی قوتوں کو مادی تقیدات سے آزاد کر کے مکاشفات اور لذات روحانی اور خوارق عادت کے حصول پر قادر ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا عالم باطنی سے قطع نظر کر کے اپنی تمام توجہ عالم مادی کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہاں وہ علم و عقل کی ساری طاقتوں کو ان طریقوں کے دریافت کرنے میں استعمال کرتا ہے جن سے وہ مادی اسباب و وسائل سے زیادہ سے زیادہ انتفاع کر کے اپنے جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش اور اپنے حواس کے لیے

زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کر سکے غرض علم و عقل ان کے خادم ضرور ہیں، مگر بجائے خود ان کی بنا جہل اور نادانی پر ہے۔

ان کے مقابلہ میں ایک مذہب وہ ہے جو خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ یہ مذہب خالص علم سے پیدا ہوا ہے، سراسر عقل کو اپیل کرتا ہے، اور اس کا اصل مقصد انسان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا ہے تاکہ وہ کائنات میں اپنی اصلی حیثیت سے واقف ہو، موجودات کے ساتھ اپنے تعلق کی حقیقی نوعیت کو سمجھے، اور علم و فہم کی اس روشنی میں اپنی تمام ظاہری و باطنی قوتوں اور مادی و روحانی وسائل کو اس مقصد تک پہنچنے میں استعمال کرے جو درحقیقت انسانی زندگی کا عقلی مقصد ہے یعنی اس دنیا میں اس منصب کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا خلیفہ بنا کر اس کے سپرد کیا ہے، اور آخرت میں اپنے مالک کی خوشنودی سے سرفراز ہونا جو اس فرض کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ مذہب انسان کی کسی قوت کو بیکار نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کو صرف کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ وہ انسان کی کسی خواہش کو پامال نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کے لیے ایک جائز اور معقول حد مقرر کر دیتا ہے، وہ تخیل کو بلند پروازی سے روکتا نہیں بلکہ اس کی پرواز کے لئے ایک بہتر فضا اور ایک صحیح رخ متعین کرتا ہے وہ انسان کی عملی قوتوں کو بھی مادی اسباب و وسائل کے اکتشاف اور ان سے انتفاع کرنے سے باز نہیں رکھتا بلکہ صحیح مقاصد کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے، وہ ہر شخص کو اسی کام میں لگاتا ہے جس کی اہلیت لے کر وہ پیدا ہوا ہے، خواہ اس کا میلان روحانیت کی طرف ہو یا مادیت کی طرف لیکن ان دونوں قسم کے انسانوں کو وہ ایسے علم اور ایسے تعقل سے بہرہ ور کر دینا چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ افراط و تفریط کو چھوڑ کر ایک صراط مستقیم پر چل سکیں، انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو سمجھیں، اور بجا لائیں، ان کی ذات پر خدا اور مخلوقات اور خود ان کے اپنے نفس کے

جو حقوق ہیں ان کو جانیں اور ادا کریں، روحانیات کی طرف جائیں تو ان میں اس قدر گم نہ ہو جائیں کہ تمام تر مکاشفات اور لذاتِ روحانی ہی ان کی جد و جہد کا محور بن کر رہ جائیں، اور مادیات کی طرف متوجہ ہوں تو ادھر بھی ان کا انہماک اس قدر نہ بڑھ جائے کہ وہ بالکل حسی لذتوں اور جسمانی آسائشوں اور مادی کامیابیوں ہی کو اپنا کعبہ مقصود بنا لیں۔

یہ سر تا سر علمی و عقلی مذہب ہے، اس لیے اس کا صحیح اتباع بھی علم اور عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہر ہر قدم پر تفقہ اور تدبر کی ضرورت ہے جو شخص اس مذہب کی روح سے نا آشنا ہو، اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو، اس کے اصول کو نہ سمجھتا ہو، اس کی تعلیم میں غور و فکر نہ کرتا ہو، وہ اُس راہِ راست پر استقامت کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جس کی طرف یہ مذہب رہنمائی کر رہا ہے۔ اس کا عقیدہ بے قیمت ہے جب تک کہ وہ اقرارِ لسانی سے گذر کر تصدیقِ قلبی نہ بن گیا ہو۔ اس کا عمل بے اثر ہے جب تک کہ وہ علم اور فہم کی روح سے معمور نہ ہو جائے۔ اس کا اتباعِ قانون بے معنی ہے جب تک کہ قانون کی اسپرٹ اس کے جوارح سے گذر کر اس کے دل و دماغ پر حاوی نہ ہو گئی ہو۔ اگر محض تقلید کی راہ سے وہ بغیر سمجھے بوجھے اس مذہب کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا اتباع کر رہا ہو، تو اس کا ایمان اور اتباع بالکل ایک ریت کے تودے کی طرح ہو گا جسے ہوا کا ہر جھونکا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ ایسے جاہل کے ایمان اور اندھے کے اتباع میں کوئی پائداری نہیں ہو سکتی۔ ہر گمراہ کرنے والا اس کو صحیح مرکز سے ہٹا سکتا ہے۔ ہر خوشنما راستہ اس کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے، ہر توہم، ہر مفروضہ، ہر نظریہ اس کے اعتقاد کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتا ہے۔ ہوائے نفس کی ہر لہر اور ضلالتِ عام کی ہر رو اس کو بہا کر کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔ اگر وہ قدامت پسند ہو گا تو اعتقاد اور عمل کی ہر اس گمراہی پر اصرار کرے گا جو آبا و اجداد سے اس کو میراث میں ملی ہو، اگر تجدد کا ذوق رکھتا ہو گا تو خواہشاتِ نفس کو اپنا خدا بنا کر ہر اس نئے راستے پر بھٹکتا پھرے گا جسے اس کے نفس کا شیطان اس کے سامنے مزین بنا کر پیش کر دے۔ اگر کمزور

طبیعت کا ہوگا تو ہر اس راہ رو کے پیچھے چل کھڑا ہوگا جو اسے زندگی کے راستے پر کسی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ قطع منازل کرتا نظر آئے۔ اگر خود اپنے اجتہاد سے کوئی راہ نکالنے کی اس میں صلاحیت ہوگی تو دین میں صحیح بصیرت نہ رکھنے اور الٰہی قانون کے اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زندگی کے سفر میں ہر دوراہے پر پہنچ کر وہ علم کے بجائے ظن و تخمین سے کام لیگا اور آخر کہیں نہ کہیں جا کر سیدھے راستے سے بھٹک ہی جائے گا۔ غرض اس خدائی مذہب کا صحیح اتباع اور اس اتباع میں استقامت جہل اور نافہمی کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ اس کے لیے علم اور سمجھ بوجھ اور غور و فکر ناگزیر ہے، اور انہی چیزوں کے مراتب کمال پر کمالِ اتباع کے درجات مترتب ہوتے ہیں۔

اس مذہب کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو ہمارے اس بیان کی صداقت آپ کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔ جتنے انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے آئے وہ صرف ایک قانون اور ایک کتاب ہی لیکر نہیں آئے بلکہ اس کے ساتھ حکمت بھی لائے تاکہ لوگ ان کی تعلیم کو سمجھیں اور علیٰ وجہ البصیرت اس قانون کی پیروی کریں جو ان کے ذریعہ سے بھیجا گیا تھا۔ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴: ۸) وَیُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳: ۵) وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ (۲: ۳۸) قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (۴۳: ۶) یہ حکمت کیا چیز تھی؟ دین کی سمجھ، علم کی روشنی، بصیرت کا نور، تدبّر کی صلاحیت، اور تفقہ کی قابلیت۔ جب کبھی کوئی نبی آیا اس نے اپنے پیرؤں کو کتاب کے ساتھ یہ چیز بھی دی اور اسی کی مدد سے لوگ سیدھے رستے پر قائم رہے۔ مگر اس کے بعد ایک دورِ جہالت اور اندھی تقلید کا آیا جس میں حکمت غائب ہوگئی اور صرف کتاب باقی رہ گئی۔ کچھ عرصہ تک لوگ محض کتاب کو لیے ہوئے اس ڈگر پر چلتے رہے جس پر ان کے اسلاف انہیں چلا گئے تھے۔ مگر اب ان میں گمراہیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی، کیونکہ وہ چیز ان میں باقی نہیں رہی

جس سے وہ کتاب کو سمجھتے اور ہدایت کو ضلالت سے ممتاز کر سکتے۔ رفتہ رفتہ ان کے قدم راہِ راست سے ہٹنے شروع ہوئے۔ کسی نے ہوائے نفس کا اتباع کیا، کسی نے ظن و تخمین کی پیروی کی، کسی نے گمراہ قوموں کے اثرات قبول کیے، کسی نے جھوٹے رہنماؤں کو ارباب من دون اللہ بنایا، آخرکار حکمت کے ساتھ کتاب بھی رخصت ہوگئی، اور خدا کے بھیجے ہوئے دین کو مسخ کرکے اوہام اور خرافات اور فکر و عمل کی گمراہیوں کا مجموعہ بنا دیا گیا۔

اس طرح بار بار دینِ الٰہی کے مسخ ہونے اور کتبِ آسمانی کے گم یا محرف ہونے، اور امتوں میں ہدایت کے بعد ضلالت کے پھیل جانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دینِ الٰہی میں اصل چیز الفاظ کتاب کی تلاوت اور رسوم مذہب کی بجا آوری نہیں ہے، بلکہ تمام تر دارومدار صحیح علم و فہم ہے۔ جب تک لوگوں میں حکمت رہی، اور وہ آیاتِ الٰہی میں تدبر کرتے رہے، اور انبیاء کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر نورِ بصیرت کے ساتھ چلتے رہے، اس وقت تک کوئی چیز ان کو گمراہ نہ کرسکی۔ اور جب یہ چیز ان سے مفقود ہوگئی تو گویا ان میں بیماریوں کی استعداد پیدا ہوگئی۔ ان کے اندر بھی امراض پیدا ہوئے اور باہر سے بھی وبائی جراثیم نے ان پر حملہ کیا یہاں تک کہ دین اور کتاب اور قانون سب کچھ کھو کر وہ ضلالت کے ہزارہا راستوں میں بھٹک گئے۔

انبیائے سابقین کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کتاب اور ایسی ہدایت دے کر بھیجا گیا، جس کو پچھلی کتابوں کی طرح مسخ اور محرف ہونے کا تو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح صورت میں باقی رکھنے کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اگر انسان اس کو بدلنے اور مٹانے کی کوشش بھی کرے تو کامیاب نہیں ہوسکتا، لیکن اب بھی اس کتاب اور اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے، اور دین کے سیدھے راستے پر قائم رہنے، اور اعتقاد و عمل کی گمراہیوں سے بچنے کا انحصار کلیۃً اسی چیز پر ہے جس کا

ابتداء سے دین الٰہی کی بنا رکھی گئی ہے، یعنی علم اور عقل۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہر زمانے اور ہر حال میں بہترین رہنما ہے، مگر ان کے لیے جو علم اور عقل رکھتے ہوں، اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کو سمجھیں، اس میں غور و خوض کریں، اس سے اکتساب نور کریں، اور زندگی کی ہر راہ میں اس نور کو لے کر چلیں۔ رہے وہ جو تفقہ و تدبر کی نعمت کھو چکے ہیں، اور صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا ان کو مسلمان چھوڑ گئے ہیں تو درحقیقت ان کے لیے دین میں کوئی استقامت ہی نہیں۔ وہ ہر وقت گمراہی کے خطرہ میں ہیں۔ گمراہی ان کے اندر سے بھی پھوٹ سکتی ہے اور باہر سے بھی حملہ کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی اپنی جہالت اور نافہمی ان کو راہ راست سے بھٹکا دے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے گرد و پیش جو ضلالتیں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے کسی کے پیچھے وہ بغیر سمجھے بوجھے لگ چلیں، کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہی نہیں ہے جو ان کو دین کے سیدھے رستے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

قرآن مجید میں انسان کی گمراہی کا اصل سبب صرف ایک چیز کو قرار دیا گیا ہے اور وہ آیات الٰہی کو نہ سمجھنا ہے، چنانچہ وہ بار بار اس پر متنبہ کرتا ہے اور نہایت شدت کے ساتھ اس کی مذمت کرتا ہے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ۔ (۸: ۳)

اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (۷: ۲۲)

ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ اور بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ - (۹ : ۱۲۷) -

اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ - (۵۹ : ۱۳) -

ان کے دلوں میں خدا سے زیادہ تمہارا (یعنی بندوں کا) خوف ہے، یہ اس لیے کہ وہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا - (۴۷ : ۲۴)

کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ - (۲۳ : ۶۸)

کیا انہوں نے اس بات پر (جو ان سے کہی جارہی ہے) غور نہیں کیا۔

اس عدم تدبر اور ناقہمی کے نتائج دو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ دونوں گمراہی کی بدترین صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ انسان بغیر سمجھے بوجھے اپنے دین و ایمان کو دوسروں پر چھوڑ دیتا ہے خواہ وہ اس کو نجات کے رستے پر لے جائیں یا ہلاکت کے رستے پر۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵ : ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف، تو بولے کہ ہمارے لیے وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ باپ دادا ہی کی تقلید کریں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں؟

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹:۵)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما، اور مشائخ کو خدا بنا لیا ہے (کہ جس کو وہ حرام کہیں وہی ان کے نزدیک حرام ہے خواہ اللہ نے اس کو حلال کیا ہو اور جس کو وہ حلال کہیں وہ ان کے نزدیک حلال ہے خواہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہو)۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ (۳۳:۸)

جب ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور کہیں گے خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر خود اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے۔ مگر اس راہ میں اول تو علم یقین نہیں ہوتا (جو راہ راست پر چلنے کا یقینی ذریعہ ہے) بلکہ زیادہ تر ظن و گمان ہوتا ہے، دوسرے بڑا خطرہ یہ ہے کہ انسان کی عقل پر نفس کی خواہشات غالب آجاتی ہیں، اور اس کو اعتدال کے خط مستقیم سے ہٹا کر افراط و تفریط کی جانب لے جاتی ہیں۔ جب انسان اس رستے پر چلتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گامزن ہو، کہیں علم صحیح اور عقل سلیم کی بجلی اتفاق سے چمک گئی تو راستہ نظر آگیا اور کچھ دور چل لیے كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ۔ ورنہ حیران ہو کر کھڑے ہو گئے وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔ یا چلے تو کسی خارزار میں جا پھنسے یا کسی گڑھے میں گر گئے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا۔ (۱۰:۴)

اور ان میں سے اکثر بجز گمان کے کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق (علم یقین) سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ	کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش
أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ	نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے .... کیا تو گمان کرتا
أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ	ہے کہ ایسے لوگوں میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ نہیں
بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۲۵:۴)	وہ تو بس جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بدراہ
وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ	اس سے زیادہ بدراہ اور کون ہوگا جس نے اللہ
هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸:۵) -	کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کی -
وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا	اور اس شخص کی بات ہرگز نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے
وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸)	اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور جس نے اپنی خواہش
	نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کے کام میں اعتدال سے تجاوز ہے
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵:۲۱)	اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے

یہ نتائج ہیں آیات الٰہی میں غور و خوض نہ کرنے اور تدبّر و تفقّہ سے کام نہ لینے کے۔ جو لوگ آیات کی تلاوت کرتے ہیں مگر ان کو نہیں سمجھتے، کتاب رکھتے ہیں مگر خود اس کی تعلیم میں بصیرت حاصل کرنے اور اس کے احکام کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، رسول کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس ہدایت کی طرف سے اندھے ہیں جو رسول نے پیش کی ہے، اسلام کی حقانیت پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اس کے اصول اور اس کی روح سے ناواقف ہیں، ان کے لیے ہر ہر قدم پر یہ خطرہ ہے کہ گمراہی کی ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت میں مبتلا ہو جائیں۔ اسی لیے اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ دین میں بصیرت پیدا کریں، اس کی تعلیم اور اس کے احکام کو سمجھیں، اور کم از کم ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے جو تفقّہ فی الدین حاصل

کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳:۳۸)

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و خوض کریں اور جو عقل رکھتے ہیں وہ اس سے سبق لیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ۔ (۱۲:۶)

ہم نے آیات کو مفصل بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۱۷:۳)

اللہ نے مومنوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان میں خود انہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (۳۷:۲)۔

اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت کچھ بھلائی دے دی گئی۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ (۱۵:۹)

پھر کیوں ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نہ نکلی تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس جا کر اپنی قوم کو آگاہ کرے۔

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بکثرت ہدایات فرمائی ہیں، مثال کے طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن رکھو

اَلَا لَا خَیْرَ فِیْ عِبَادَۃٍ لَیْسَ فِیْھَا تَفَقُّہٌ وَلَا عِلْمٍ لَیْسَ فِیْہِ تَفَھُّمٌ وَلَا قِرَاۃٍ لَیْسَ فِیْھَا تَدَبُّرٌ۔

کہ اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے، اور اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبّر نہیں ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

مَنْ یُّرِدِ اللہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ

اللہ جس کے لیے بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین میں تفقہ عطا کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

اَفْضَلُ النَّاسِ اَفْضَلُھُمْ عَمَلًا اِذَا فَقِھُوْا دِیْنَھُمْ۔

لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو عمل کے اعتبار سے بہتر ہیں بشرطیکہ دین میں سمجھ بوجھ رکھتے ہوں

اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی بلکہ اصلی مصیبت یہی ہے کہ ان میں تفقّہ فی الدین اور تدبّر فی الکتٰب والسنۃ نہیں ہے۔ اسی چیز کے فقدان نے ان کے اعتقادات کو کھوکھلا، ان کی عبادات کو بے روح ان کی مساعی کو پراگندہ و پریشان، اور ان کی زندگیوں کو بے ضابطہ و بدنظم کر دیا ہے۔ اسلام کے شیدائی ان میں بہت ہیں، مگر اسلام کو سمجھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر مرمٹنے والوں کی کمی نہیں، مگر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین اور شریعت کو پیش کیا ہے اس کی روح اور اس کے اصول کو سمجھنے والے کالملح فی الطعام بلکہ اتنے بھی نہیں۔ یہ اسی ناسمجھی کے نتائج ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں ان میں بدترین قسم کے توہمات اور مشرکانہ عقائد سے لے کر الحاد، دہریت اور کفر کی حد کو پہنچے ہوئے خیالات تک پائے جاتے ہیں

اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ جس اسلام کی پیروی کے وہ مدعی ہیں اس میں اور ان خیالات میں کلی تباین ہے۔ اس سے بدتر حالت اخلاق عملی زندگی کی ہے۔ بت پرستانہ رسوم و رواجات سے لیکر جدید مغربی تہذیب کے بدترین ثمرات تک ہر قسم کے اطوار اس قوم میں رائج ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کا پیرو کہتی ہے، اور الا ماشاء اللہ کسی گروہ کو یہ احساس تک نہیں کہ وہ کہاں کہاں اس قانون کے اصول اور قواعد سے صریح انحراف کر گئی ہے جس پر ایمان رکھنے کا اس کو دعویٰ ہے۔ ہر غلط خیال اور غلط طریقہ جو کہیں سے آتا ہے ان میں رواج پا جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ ہر گمراہ کن شخص جو کسی خوش آیند طریقہ پر چل رہا ہے، بآسانی ان کا رہنما بن جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم اس کی پیروی بھی کرسکتے ہیں۔ ہر چیز جو غیر اسلام ہے وہ بے تکلف اسلام کے ساتھ ایک ہی دماغ اور ایک ہی زندگی میں جمع کرلی جاتی ہے، کیونکہ اسلام اور غیر اسلام کا امتیاز علم و فہم پر موقوف ہے، اور اسی کا یہاں فقدان ہے۔ جو شخص مشرق اور مغرب کا فرق جانتا ہو وہ کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ مشرق کی طرف چل رہا ہو اور یہ سمجھے کہ مغرب کی سمت جا رہا ہوں۔ یہ فعل صرف ایک جاہل ہی کا ہوسکتا ہے، اور یہی جہالت ہم ایک نہایت قلیل جماعت کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک کے مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ ان پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علماء، یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ یکساں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت ہی حکیمانہ ارشاد ہے کہ۔

صنفان اذا اصلحا صلحت الامۃ واذا دو گروہ ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو امت درست

فسدا فسدت الامۃ، السلطان والعلماء۔ ہے۔ اور اگر وہ بگڑ جائیں تو امت بگڑ جائے حکمران اور علماء۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ہر باب اس ارشاد نبوی کی صداقت پر گواہ ہے، اور سب سے زیادہ آج ہم اس کی صداقت کو نمایاں دیکھ رہے ہیں اگر ہمارے حکمرانوں اور علماء میں تقویٰ اور دین کا صحیح علم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی، اور آج بھی اگر مسلمان قوموں کو ایسے رہنما میسر آجائیں تو حالات کے اس درجہ بگڑ جانے پر بھی اصلاح سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

مقالات

قرآن مجید کا رسم الخط

از جناب مولنا عبد القدیر صاحب صدیقی

"اس مقالہ میں جناب مولنا عبد القدیر صاحب صدیقی نے قرآن مجید کے رسم الخط کی اصلاح وترقی کے لیے چند تجاویز پیش کی ہیں۔ مصر ترکی اور ہندوستان کے مختلف مصاحف میں جن مختلف رسوم خط کی پابندی کی گئی ہے ان سب کی خصوصیات پر نظر ڈالکر مولنا نے ایک ایسا رسم الخط اختیار کیا ہے جس میں سب کی مفید خصوصیات جمع کردی گئی ہیں۔ اگر اہل علم حضرات اس پر غور کرکے اپنی اپنی تجاویز پیش کریں تو اس رسم الخط میں مزید اصلاح ہوسکتی ہے اور پھر ہندوستان میں اسی رسم کو جاری کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے"

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ قرآن شریف الواح میں لکھا ہوا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ملا بلکہ آپنے جبرئیل امین کی زبان سے سنا اور اپنی امت کو سنایا۔ حضرت کے زمانے ہی میں حضرت کے حکم سے قرآن شریف لکھا گیا مگر متفرق طور پر کہیں کاغذ پر کہیں پتوں پر کہیں شانے کی ہڈیوں پر۔ مگر حافظ قرآن بکثرت تھے ان میں سے ممتاز جن سے قرآن شریف کی روایت ہے حسب ذیل ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی رسول اللہ تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جنگ مسیلمہ میں حفاظ قرآن بہت شہید ہوئے تو انہوں نے تمام نوشتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان نوشتوں کو ایک مصحف کی صورت میں ترتیب دیا۔ اور ان کی سات نقلیں کر کے مختلف ممالک میں روانہ کیں ابتدائی زمانہ میں نہ رسم الخط درست تھا نہ قرآن شریف کو اعراب لگا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص نے پڑھا اِنَّ اللہَ بَرِیٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلِہٖ بجر لام حالانکہ قرآن شریف میں وَرَسُوْلُہٗ ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نحو کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا اور حضرت علیؓ نے ابوالاسود دُئلی کو چند اصولی قواعد سنا کر قواعد نحو جمع کرنے کے لیے حکم دیا۔

مسلمانوں نے قرآن شریف کی حفاظت میں اتنی سعی و کوشش کی کہ لاکھوں حافظ اور لاکھوں ہی اس کے قاری ہیں کسی آیت کی کمی و زیادت تو کجا، زیر زبر کی غلطی تو کد ہر قلقلہ و ہمس۔ اخفا، اظہار، ادغام وغیرہ صفات میں بھی فرق نہیں آسکتا۔ مراکو سے چین تک صحیح قرآن شریف پڑھنے والے سب قاف کو مستعلیہ اور با قلقلہ ہی پڑھیں گے۔ لحن چاہے بدلا ہوا ہو۔ مگر تلفظ سب کا ایک ہوگا۔ یہ تو صوت اور تلفظ قرآن کی حفاظت ہے۔

قرآن شریف کے خط کی اتنی حفاظت کی گئی کہ بیان کر دیا گیا کہ اس میں الف کتنے ہیں اور بے کتنے ہیں، کتنے ہیں اور یا کتنے۔ کس لفظ پر قرآن شریف نصف ہوتا ہے (کہف میں وَلْیَتَلَطَّفْ پر)۔ تین روز میں قرآن پڑھنا چاہیں تو روز کتنا پڑھنا چاہیے۔ (منزل فیل یعنے فاتحہ۔ یونس نقمان)۔ ایک ہفتہ میں قرآن ختم کرنا چاہیں تو روز کتنا پڑھنا چاہیے۔ (فمی بشوق یعنے فاتحہ مائدہ۔ یونس۔ بنی اسرائیل۔ شعراء والصّٰفّٰت۔ قاف (ق)۔ مہینے بھر میں پڑھنا چاہیے تو کتنا پڑھنا چاہیے۔ (۱) الم (۲) سیقول۔ ۳۰ پارے۔

مسلمانوں نے حضرت عثمان کے زمانے میں لکھے ہوئے قرآن شریف کے رسم الخط کی تقلید کا

اہتمام کیا کہ کسی قسم کا فرق ہونے نہیں دیا۔ البتہ ترکوں کے ہاں ایک قرآن طبع ہوا ہے جس میں رسم الخط قرآنی کا اتباع نہیں کیا گیا ہے بلکہ جس طرح تلفظ ہوتا ہے اُسی طرح لکھا ہوا ہے۔

مطبوعہ ہند اور سلطنت مصریہ کے زیر نگرانی جو قرآن شریف طبع ہوا ہے، ان میں تلاوت کرنے والے کے لیے بڑی بڑی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ حالانکہ رسم مصحف عثمانی کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآن شریف کو مشکل باعراب حجاج بن یوسف ثقفی نے لکھوا کر شائع کرایا جو عبدالملک کا سپہ سالار اعظم تھا۔ یہ اس مشہور ظالم کی ایک ایسی نیکی ہے جو قیامت تک رہے گی

اب میں اہل ہند و عرب و سلطنت مصریہ کے زیر نگرانی جو قرآن شریف طبع ہوئے ہیں۔ ان کے اختلافات کو بیان کرتا ہوں

(۱) ا۔ الف ہمیشہ ساکن بے ضغطا اور بغیر زبان کے جھٹکے سے کے نکلتا ہے اگر کسی الف نما حرف جزم دیکھو تو اس کو ہمزہ سمجھو جیسے ہندی ان یشا کو اہل مصر اس طرح لکھتے ہیں أْن یشأ یہ چیز قابل تقلید ہے۔

(۲) الف زائد کبھی رسم الخط میں کوئی علامت نہیں رہتی مگر الف رہتا ہے جیسے ملك کہ وہ مالک ہے۔ اہل ہند میم پر کھڑا زبر دیتے ہیں۔ مٰلك۔ اور مصری سلطانی قرآن شریف میں میم کے زبر کے ساتھ چھوٹا الف لکھتے ہیں۔ مَٰلك۔

(۳) کبھی الف زائد ہوتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا جیسے ثمودا لااذبحنّہ عام قرآن شریفوں میں اس امر پر متنبہ کرنے کے لیے کوئی علامت نہیں۔ لیکن یسرنا القرآن کے قرآن شریف میں غیر ملفوظ الف پر کہیں کہیں چلیپا بنایا ہے مثلاً لا اْذ بحنہ مصری قرآن شریف میں گول صفر ہر جگہ دیا گیا ہے۔ ثَمُودَاْ لَاْاَذْبَحَنَّہٗ جو قابل تقلید ہے۔

(۴) کبھی و لکھا جاتا ہے اور الف پڑھا جاتا ہے جیسے الصلوٰۃ ہندی رسم الصلوٰۃ مصری رسم الصَّلَوٰۃ۔

(۵) کبھی ایک شوشہ یا دندانہ ہوتا ہے۔ اور الف پڑھا جاتا ہے جیسے۔ مکیل ہندی رسم ھونہٗ مصری مِکٰیل۔ ھَوٰنہٗ۔ مہکلمل

(۶) کبھی وصل کی حالت میں صرف فتحہ پڑھا جاتا ہے۔ اور وقف کی حالت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے۔ انا لکنا۔ سلا سلا۔ مصری مصحف میں اس کی علامت لمبا صفر دیا گیا ہے جیسے۔ انَاْ لٰکِنَّاْ۔ سلَا سِلَاْ جو قابل تقلید ہے۔

(۷) کبھی الف یا واو یا یا لکھی نہیں جاتی مگر پڑھی جاتی ہے جیسے ہندی لِاٰ لف مصری لِاٰی لٰفِ۔ ہندی بہٖ مصری بِہٖ۔ ہندی لہٗ مصری لَہٗ۔ ہندی النبیّٖن مصری النَّبِیّٖنَ۔ ہندی داوٗد مصری داوٗد۔

(۸) ہمزۂ وصل حالت وصل میں گر جاتا ہے اور بوقت ابتدا متحرک و باقی رہتا ہے۔ رسم ہندی میں ہمزۂ وصل وصل میں گر گیا ہو تو اس پر حرکت نہیں دیتے۔ اگر ابتدائے آیت میں ہو تو اس کو حرکت دیتے ہیں۔ رسم مصری میں ہمزۂ وصل پر (صہ) کی علامت دیتے ہیں اور حمیدیہ مصحف میں ہر جگہ سرخی حرکت بھی دیتے ہیں۔ ہندی الحمد للہِ رب العٰلمین مصری حمیدی الحمد للہ رب العالمین۔ ہندی الرحمٰن الرحیم۔ مصری حمیدی الرحمن الرحیم۔

(۹) مد دو طرح پر ہے (۱) مد متوسط کی علامت یہ ~ ہے اور مد طویل کی علامت یہ ہے ~ مگر اس کی پابندی کوئی نہیں کرتا حتیٰ کہ مصری مصحف میں بھی دونوں کی علامتوں میں تمیز نہیں۔

(۱۰) نون ساکن قبل حروف یرملون۔ نون ساکن حروف یرملون میں مدغم ہوتا ہے۔ اس حرف پر شد دیا جاتا ہے۔ جیسے ہندی رسم میں۔ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ۔ غفورًا رَّحِیْمًا مصری رسم میں خُشُبٌ

مسندہ۔ غفورا رحیما۔ یومئذٍ ناعمہ۔ اعراب اس طرح دیتے ہیں ـُـُ ـًـً معلوم ہے کہ غیر را ولام میں غنہ رہتا ہے۔ لہذا اس کی علامت (غ) بھی ضرور ہے۔

(۱۱) نون ساکن قبل حروف حلقی مظہر رہتا ہے۔ وہاں کسی علامت کی ضرورت نہیں لہذا مصری اعراب اس طرح ہے ـُـُ ـًـً

(۱۲) نون ساکن قبل حروف غیر حرف حلقی و یرملون میں صرف بمبئی کے ایک قرآن شریف میں اخفا کی علامت (خ) لکھی ہوی ہے۔ اور دوسرے مصاحف میں کوئی علامت نہیں ہے۔ مصری میں ـُـُ ـًـً۔ میری رائے میں بمبئی کے قرآن شریف کا اتباع ضروری ہے۔

(۱۳) نون ساکن قبل با میم ہو جاتا ہے لہذا اس کی علامت چھوٹی م ہے جیسے من بعد انبئت ہندی الیمًا مصری الیمًا۔

(۱۴) میم قبل با میم ساکن قبل با میں بھی غنہ پیدا ہوتا ہے۔ اس پر بھی (غ) کی علامت ہونی چاہیے

(۱۵) میم۔ اگر میم مشدد ہو تو غنہ پیدا ہوتا ہے جیسے ثُمَّ۔ عَمَّ۔ بمبئی کے ایک قرآن میں جہاں جہاں غنّہ پیدا ہوتا ہے اس حرف پر (غ) کی علامت دی گئی ہے۔ عام طور پر یہ علامت نہیں ہوتی جو ضروری ہے۔

(۱۶) بعض دفعہ رفع اجتماع ساکنین کے خیال سے نون تنوین کو متحرک کردیتے ہیں اس کے لئے عرب و مصر کے مصاحف میں کچھ انتظام نہیں مصاحف ہند میں اس طرح ہے اور ہونا بھی چاہیے مبین ن اقتلو تدیر ن الذی۔ اس نون کو اہل ہند نون قطنی کہتے ہیں۔

(۱۷) غیر با، مدور پر فتحہ کے ساتھ تنوین ہو تو وقف کی حالت میں الف سے بدل جاتی ہے اور اسی لیے اس کے ساتھ الف بھی لکھتے ہیں۔ جیسے۔ شیئا۔ شیئًا بعض دفعہ الف نہیں ہوتا وہاں علامت کی ضرورت ہے مثلاً (فا) یا جیسے ضُحٰیً۔ نساءً۔ مصلًّی۔

(۱۸) ت۔ ۃ ۃ تا کہیں دراز ہے کہیں گول۔ دراز ہر تا پر وقف کرنا چاہیے۔ گول پر ہا مطابع ہندمیں اس کی کماحقہ تحقیق نہیں کی جاتی۔ مطبع نظامی کے قرآن شریف میں الملار قرآنی کو حاشیہ پر فارسی زبان میں لکھا ہے۔

(۱۹) بعض دفعہ لکھا ہوا (ص، رہتا ہے اور ص سے س یا دونوں جائز ہیں مگر ص اولیٰ ہے جیسے یبصط فی الخلق۔ یصطہ ان میں س کا تلفظ ہے۔ المصیطرون (س۔ص) دونوں صحیح ہیں مگر (ص) اولیٰ ہے مگر یہ مصری مصحف میں ہے ہندی مصحفوں میں اس کا انتظام نہیں۔ بعض کے صرف اوپر س لکھدیتے ہیں میری رائے میں تقلید مصری ضروری ہے۔

(۲۰) بعض مقامات میں راسے پہلے کسرہ عارضی یا اس کے بعد حرف مستعلیہ ہو تو را مفخم پڑھی جاتی ہے۔ میری رائے میں ایسے را پر (ف) لکھنا چاہیے ارجعوا مرصاد۔

(۲۱) روایت حفص میں ایک جگہ امالہ ہے امالہ کی علامت ہ بسم اللہ مجریھا۔ یہ علامت صرف مصحف مصری میں ہے۔ میری رائے میں (امالہ) لکھدینا چاہیے۔

(۲۲) روایت حفص میں ایک جگہ اشمام ہے اشمام کی علامت مالک لا تامنا علیٰ یوسف یہ اشارہ صرف مصحف مصری میں ہے میری رائے میں شم لکھنا چاہیے۔

(۲۳) روایت حفص میں ایک جگہ تسہیل ہے تسہیل کی علامت أأعجمی و عربی یہ اشارہ مصحف مصری میں ہے میری رائے میں (تسہیل) لکھدینا چاہیے۔

(۲۴) حفص کی روایت میں چند ہی جگہ سکتہ صحیحہ ہے اور ہندی مصاحف میں بہت جگہ سکتہ لکھا ہوا ہے جو درست نہیں۔ لہٰذا ان مقامات میں (سکتہ صحیحہ) لکھنا چاہیے۔ اور باقی تمام مقامات میں سکتہ کا لفظ نہ لکھنا چاہیے۔

(۲۵) عموماً قرآن شریف میں یومیذ ہے صرف دو جگہ یومئذ ہے اور عموماً نیلہ ہے ایک جگہ

فیہ یا فیہٖ ہے اور عموماً علیہ ۔ ہے اور ایک جگہ علیہُ ہے ان سب مقامات میں ایک خط کھینچ دیا جائے تو تیز پڑھنے والا متنبہ ہو جائے گا ۔ کیونکہ تیز پڑھنے والے کی زبان حسب عادت چل جاتی ہے ۔ یومئذ۔ فیہ ۔ علیہ نیز ہر اس جگہ کہ آدمی بے توجہی سے غلطی کرتا ہے بخیال تنبیہ اس پر خط کھینچنا بہتر ہے ۔

(۲۶) وقف کے علامات بلا تحقیق لکھے جاتے ہیں مصحف مصری علامات وقف بڑے اہتمام سے مجلس علماء و قراء کے تصفیہ کے بعد لکھتے ہیں ۔ میری رائے میں مصری علامات وقف پر اعتماد کرنا چاہئے۔

(۲۷) ہندی مصاحف میں رکوع کی علامت (ع) ہے مثلاً ؏ (۲) سورت سے دوسرا رکوع ہے ۔ (۳۰) اس رکوع میں تیس آیتیں ہیں ۔ (۴) پارے سے چوتھا رکوع ہے میری رائے میں رکوع کا ہونا ضرور ہے ۔

(۲۸) آیات کا نمبر مصری مصحف میں ہے اور بعض ہندی مصحف میں بھی ہے ۔ میری رائے میں آیت کا نمبر دینا بھی ضروری ہے ۔

(۲۹) مصحف ہندی میں ہر پارہ یا جزو ابتدا صفحہ سے لکھتے ہیں ۔ تاکہ کئی آدمی مل کر ختم کر سکیں مصحف عرب میں اس پر کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا ۔ میری رائے میں مصحف ہند کا اہتمام ضروری ہے ۔

(۳۰) عربی مصاحف میں جزو کو (مقرا میں تقسیم کیا گیا ہے غیث النفع وغیرہ میں اس کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لہذا حسب مصحف مصری مقرا بھی لکھا جائے ۔

میں نے تمام مختار علامات کے ساتھ جو مصحف ہندی و مصری سے جمع کئے گئے ہیں چند سورتیں اور آیات لکھی ہیں تاکہ قرآن شریف تلاوت کرنے والوں کو ان سے جو سہولت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہو سکے ۔

انسانیت کی تقسیم کے چند مختلف پہلو

از جناب مولٰنا مناظر احسن گیلانی استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۳)

سلسلہ اشاعت رجب ۱۳۵۴ھ

ظاہریوں کی باطنیت و معنویت یا خارجی اوصاف اور بیرونی اضافات و امتیازات کی بنیادوں پر انسان کی تقسیم اگر غلط ثابت ہوی تو اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟ آخر جس کا سب کچھ اندر تھا، دہوکہ کھانے والوں نے کیوں دھوکہ کھایا جب انھوں نے اس کو باہر ہیں ڈھونڈا؟ پتھر سے پانی کون نچوڑ سکتا ہے؟ کیا تم مرچ سے شکر نکالوگے؟ نیم کی شاخوں سے کس نے انگور توڑے ہیں؟

دیوانو! جو اندر تھا، کیوں نہیں تقسیم کے وقت بھی تم نے اس کے اندر ہی جھانکا؟ اور جن کی نظر انسان کے چرم و استخواں پر نہیں اس کی خوابگاہ، سیرگاہ پر نہیں، اصطلاحی اور من مانے الفاظ اور بولیوں پر نہیں نسبی اور اضافی رشتوں پر نہیں بلکہ ان کمالات و جذبات پر پڑی جنہوں نے انسان کو انسان بنایا ہے اور جن کا نام واقع میں انسانیت ہے، ہر زمانہ میں ہر ملک میں ان صادق دانش والوں نے انسان کو باطنی اوصاف ہی کی بنیاد پر مختلف صفوں میں کھڑا کیا بلکہ وہ بھی جو فریب کھانے یا فریب دینے کے وقت انسان کی سطح پر تیرتے اور دوسروں کو تراتے ہیں جب واقعات کے عالم میں آتے ہیں اور وہم و فرض کے دائروں سے نکل کر حقیقت کے میدان میں اترتے ہیں تو کیا نہیں دیکھتے کہ وہی جو رنگ و بیرنگی کے وسوسوں کی پچکاریوں سے انسانیت کی فضا کو مکدر کر رہے تھے، اور کاغذی خطوط، اطلسی نقوش کو دکھا دکھا کر ابلہوں کے شعوری غنود سے نفع اٹھا کر اس مغالطہ کے

جال میں دنیا کو تڑپا رہے تھے، کہ جو لکیریں کاغذ کی سطح پر ہیں، دیکھو نہیں بلکہ سمجھو اور صرف سمجھو کہ قومی زمین کا چہرہ بھی ان سے داغدار ہے، اُف! جن ظالموں نے انسان کے منہ کو بگڑا اور اس کی زبان کو اس لیے مروڑا کہ دل کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے ہوا میں تموجات کیوں نہیں پیدا کرتے جو ان کے لب دنداں سے پیدا ہوتے ہیں اور جنہوں نے شیر کے بچوں کو بزغالوں پر نہیں بلکہ آدم ہی کی اولاد اور حوا ہی کے لڑکوں میں سے ایک کو دوسرے پر خون کا پیاسا بنا کر اس لیے چھوڑا کہ ان کا خون وہ نہیں ہے جو دوسرے میں ہے حالانکہ دونوں میں آدمی ہی کا خون تھا اور کوئی ان میں نہ بھیڑیے کی نسل سے تھا نہ چکاروں کی پشت سے نکلا تھا نہ کوئی ان میں گھوڑوں کا پوتا تھا اور نہ اونٹوں کا نواسہ، مگر بگاڑ کے ان بانیوں کو جب سنوارنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس وقت بھی تقسیم کے بیرونی وجوہ کا کیا اسی طرح انکار نہیں کرتے جس طرح میں ان کی واقعیت کو مسلسل جھٹلاتا چلا آ رہا ہوں؟

ذہنی رجحانات، باطنی احساسات، خیالی حسیات کے سوا ان کے سامنے اور کیا رہتا ہے، جب یہ پارٹیاں بناتے ہیں اور جماعت بندیوں کی طرح ڈالتے ہیں؟ گرم و نرم قدامت پسند و رجعت پسند لبرل و لیبر خدا جانے کیا کیا اصطلاحیں ہیں۔ بتایا جائے کہ انسان کی یہ صرف باطنی تقسیم ہی نہیں ہے؟ لیکن یہ تقسیم اصلاح کے لیے ہوتی ہے، اور وہ بانٹ افساد کے لیے تھی، یقیناً وہ بھی جب ملانا چاہتے ہیں تو اندر ہی دیکھتے ہیں پر جب لڑانا چاہتے ہیں تب باہر آ کر مغناطیسوں کی وہ گیس پھیلاتے ہیں جس نے کتنوں کو ختم کیا اور کتنے دنیا کے ہر خطہ میں اب تک بے ہوش پڑے ہیں۔ پھر جو الجھے ہوؤں کو سلجھانے کے لیے آئے اور ہر جگہ آئے (صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ) کس قدر غلط بات ہوتی اگر وہ بھی انسانیت کی تقسیم کے وقت انسان کو باہر سے دیکھتے! بلا شبہ جو تقسیم، تفریق کے لیے ہوگی اس میں ہمیشہ باہر کو دیکھا جائے گا۔ جیسا کہ بار بار دہراتا آ رہا ہوں کہ

یہی وہ فصل ہے جو وصل سے بدل نہیں سکتا۔ یہی وہ ڈھکیل ہے جس سے میل پیدا نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ راہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں، ایسی راہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن جن کی تقسیم تنظیم کے لیے ہے، جن کا انفصال اتصال کے لیے ہے، جن کا توڑ جوڑ کے لیے ہے تم نے کیوں آرزو کی کہ کاش ملانے والوں کا یہ پاک و برگزیدہ گروہ بھی وہی کرتا جو لڑانے والوں نے کیا؟

"هُلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ"

بیناؤں سے تم نے وہ امید باندھی جو اندھے کرتے ہیں، داناؤں سے تم وہ مانگتے ہو جو نادان دیتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

مذہبی اختلافات کی اہمیت | شاید جس طرح دو چہرے باہم اس طرح نہیں ملتے کہ ایک کی وجہ سے دوسرا نہ پہچانا جائے، اور باوجود دو ہی آنکھوں دو ہی کانوں، ایک ناک اور دو نتھنوں، دو ابروؤں اور ایک پیشانی کے جو ہر چہرے پر ہر شخص کے لیے ہے اور ایک ہی جگہ پر ہے، نہ کسی کی آنکھیں سر کی چندیا میں ٹھونکی گئیں، اور نہ کسی کی ناک کلوں میں جڑی گئی، نہ کسی کے لب پیشانی پر چڑھائے گئے، تاہم لاکھوں کی بھیڑ میں کس نے اپنے بچے کو اس لیے گم کیا کہ اس کا لخت جگر دوسرے کے لڑکے سے ممتاز نہیں ہوتا تھا؟ حتیٰ کہ بے رنگوں کے جس گروہ کو زنگدار قومیں کچھ ایک ہی شکل وصورت کی پاتی ہیں لندن کے میلوں پیرس کے جھمیلوں میں، نیت کی غلطی کو میں نہیں کہتا لیکن شناخت کی غلطی سے کیا کسی نے دوسرے کی بیوی کو کبھی اپنی بیوی ٹھیرایا؟ ریوٹر نے شاید کبھی ایسی خبر نہیں پھیلائی، اور نہ ہاناس نے اس واقعہ سے دنیا میں سنسنی پیدا کی، بلا شبہ

فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۔ جس صورت وشکل میں خدا نے تجھے اے انسان! چاہا بنا ڈالا کا ایک مدہش نظارہ ہے۔ کثرت کے اس گھنے جنگل میں وحدت مشیّتہ وارادہ کا یہ ہوش ربا

تماشا ہے لیکن چہرے تو پھر بھی طول رکھتے ہیں، ان کا عرض بھی کافی ہے، اس سے بھی بڑھکر صناعی کے لیے خیرگی کا سامان ان زبانوں میں ہے جن کی وسعت کی پیمائش بہ مشکل انچ دو انچ سے کی جا سکتی ہے، ہر منہ میں گوشت کا ایک انچی ٹکڑا ہے، سب میں وہی پٹھے ہیں وہی رگیں ہیں، وہی ریشے، وہی اعصاب لیکن باوجود اس وحدت کے کیا زید کی آواز بکر کی پکار سے مخلوط ہوسکتی ہے؟ کون بول رہا ہے پہچانا جاتا ہے، خواہ وہ سامنے ہو یا کسی دیوار کی اوٹ سے بول رہا ہو۔ ارادہ کی قوت اور کیسی زبردست قوت ہے جس نے ایک کو ہر ایک سے باہم جدا کر دیا ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ۔ (اللہ کے پتوں میں سے ایک پتہ زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے)

تم نے ملکوں اور قوموں ہی کی زبانوں کو صرف جدا سمجھا، لیکن جو اس سے بھی زیادہ گہرائیوں میں جاتے ہیں ان کو تو ہر ایک کی زبان، ہر زبان کی ہر آواز دوسروں کی زبان سے بالکل جدا نظر آتی اور یہی حال چہروں کے رنگوں کا ہے دو ماں جائے بھائیوں کے رنگ و روغن بھی ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے مانند نہیں ہوتے۔

کثرت میں وحدت کی یہی وہ نمائش ہے جس نے انسان کو نشان ابہام (انگوٹھے کے نشان) کا علم عطا کیا، اور جس پر قانون کے ایک بڑے حصہ کی بنیاد قائم ہے۔

بہرحال جس طرح ایک شخص کی صورت دوسرے کی صورت سے نہیں ملتی ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے جدا ہوتی ہے، ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسروں کے انگوٹھوں کے نشانات سے ممتاز ہوتی ہیں، لاکھوں کروروں میں ممتاز ہوتی ہیں، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ باوجود انسان ہونے کے ہر انسان کی فطرت، ہر ایک کی سمجھ، ہر ایک کی طبیعت، ہر ایک کا دماغ، ہر ایک کا فہم اپنے شخصی وجود میں کوئی ایسی خصوصیت و شاکلہ ضرور رکھتا ہے جو اس کو ان لوگوں سے جدا کر دیتا ہے جن کے متعلق عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں ہم فطرۃ

ہم خیال، ہم فہم، ہم دماغ ہیں۔ ہوتا ہے، اتحاد ہوتا ہے ہزار ہا نقاط تک دو آدمیوں میں اتحاد ہوتا ہے، ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن اکثر امور میں اشتراک کے یہ معنی قطعاً غلط ہیں کہ سب باتوں میں اشتراک ہے، تجربہ کرو اپنے اپنے دوستوں کو جانچو! جن سے تمہارے دل ملے ہوئے ہیں ان میں ٹٹولو! ساتھ دیں گے، بہت دور تک تمہارا ساتھ دیں گے، دیتے چلے جائیں گے لیکن ناممکن ہے کہ بالآخر وہ اختصاصی نقطہ نہ نکل آئے جو تم کو اس سے اور اس کو تم سے جدا نہ کر دے، اور یہیں کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ کی تفسیر مکمل ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ بھی ایک مقام ہے جہاں ادراک و تعقل کی ساری تعلیلی لن ترانیاں ”ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ“ کی نہ ہلنے والی چٹانوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہیں۔

بلاشبہ متین قوت والے قادر و مقتدر نے کثرتی وحدت اور وحدتی کثرت کی انہی حیرت انگیز نزاکتوں میں اپنی طاقتوں کی نمائش کی ہے، قابو! اور کیسا آہنی قابو ہے جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، میں تو صرف دو آدمیوں کے متعلق کلی اشتراک اور تام وحدت کا انکار کر رہا ہوں لیکن جن کی نگاہیں زیادہ تیز اور زیادہ خوردبین ہیں انہوں نے گلاب کی دو پنکھڑیوں کو بھی باہم ہر اعتبار سے یکساں نہیں پایا۔ وحدت میں کثرت کی یہ کارفرمائیاں، انسان، حیوان، نباتات، جماد، محسوس نامحسوس غیب و شہادت سب کے لیے عام ہیں کہ مقصود جب کمالات کا ظہور رہے تو دو چیزوں سے ایک ہی کمال کی نمائش کس طرح ہو سکتی ہے۔ روحانی دانش والے اسی کی تعبیر میں کہتے ہیں کہ ”تجلیات میں تکرار ناممکن ہے ورنہ خالق پر عبث کاری کا الزام عائد ہوگا“ اور وہ جو سہ

یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تم "رندانِ مست" کی زبان سے سنتے ہو، کیا وہ بھی وہی نہیں کہہ رہا ہے جسے تم نے عالی مقام صوفیوں سے سُنا؟ کثرت و وحدت کی ان پیچ در پیچ گتھیوں میں الجھے ہوئے عالم میں اس کی آس باندھنی کیسی بوالفضولی ہوگی کہ سب کا خیال ایک ہو، سب کی سمجھ ایک ہو، جو ایک سوچتا ہے وہی سب سوچیں، جو ایک پاتا ہے وہی سب پائیں، اور جب ایسا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہوا نہ آیندہ ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر ان ابلہوں کو کون سمجھائے جو اپنی تقریروں سے، تحریروں سے، شور سے، شغب سے، غل سے، غپاڑے سے، ٹھٹھوں سے، قہقہوں سے دیوانوں کو یہ باور کراتے پھرتے ہیں کہ ان سارے اختلافات کا ذمہ دار مذہب اور بانیان مذہب ہیں جنہوں نے بجائے باہر کے انسان کو اندر سے، بجائے خارجی صفات، اضطراری اوصاف، وہمی اضافات، نسبی تعلقات کے آدمی کو باطنی خیالات، اندرونی جذبات، ذہنی احساسات کی بنیادوں پر جانچا اور ان ہی اساسوں پر ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا؟

کیسے لوگ ہیں! جن اختلافات کا ذمہ دار خود انسان تھا انہوں نے ان کی ذمہ داری انسان پر نہیں بلکہ انسان کے مذہب اور دین کے سر تھوپ دی۔ لڑتا انسان ہے لیکن احمق چلاتے ہیں کہ انسان کا مذہب لڑ گیا۔ اختلاف آدمیوں میں ہے لیکن بے وقوف چیختے ہیں کہ یہ اختلاف آدمیوں کے مذہب میں ہے، حالانکہ میں کہہ چکا کہ "موجودہ نظام ہستی" کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے جو اس کو بالآخر کہیں نہ کہیں کائنات کی تمام چیزوں سے جدا کر کے ایک ایسی مخصوص و متعین چیز قرار دیتی ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی نہیں فطرت کا یہ اٹل قانون ہے دنیا کی ساخت اسی قالب پر ڈھلی ہے جس کی نمائش پتے پتے، بوٹے بوٹے میں ان لوگوں کے لیے بے نقاب ہو کر ہو رہی ہے۔ جو دیکھ سکتے ہیں، اور جنہیں تحقیق کی بینائی بخشی گئی ہے۔

فطرت کے اسی ناقابل مقابلہ قانون کا ظہور جب آفاقی کائنات کی پیشانیوں سے ہوتا ہے تو وہی جو انسانی اختلافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے؛ وہ

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

کے ساتھ اپنے بربطوں پر ناچتے ہیں، تھرکتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، مگر جہان کے ایک جز انسان کے اندر سے جب اسی اختلاف کے آثار جھلکنے لگتے ہیں تو اس وقت ان کا ہذیان قابل دید ہوتا ہے۔ جب انسانی اختلافات کا غلط الزام مذہب کے سر منڈھ کر یہ دین اور دین کے علمبرداروں (علیہم السلام) کے متعلق اول فول کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، سب وشتم گالیاں دشنام طرازیاں، لعنت پھٹکار، کوئی ایسی چیز رہ جاتی ہے جسے ان کا قلم نہ اگلتا ہو اور ان کے ساتھ ان کی زبان نہ بڑبڑاتی ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں سے ایک بڑی کوڑی لائے، جب مذہبی اختلافات کا افسانہ سنا سنا کر مذہب سے باغی بنانے کے لیے آدمی کی توجہ باطن سے ہٹا کر ظاہر کی طرف یہ پھیرتے ہیں، ان میں کوئی رنگ کا شگوفہ چھوڑتا ہے، کوئی زبان کا جھنڈا کھڑا کرتا ہے، کوئی ان فرضی لکیروں اور وہمی دائروں کا بھجن گاتا ہے جنھیں سب دیکھنا چاہتے ہیں لیکن کسی نے نہیں دیکھا۔ کوئی نسب کے شجروں کو بانسوں میں باندھ کر ہوا میں اڑاتا ہے، اور وہ مسکین بیچارا انسان جس کی ساری پونجی اندر تھی بوکھلاہٹ میں سب کچھ کھو بیٹھتا ہے لیکن جس کے لیے کھوتا ہے اسے بھی نہیں پاتا کہ وہ اختلاف سے بھاگا تھا، اسے انسان کے شخصی و فطری اختلافات کو غلطی سے مذہب کا اختلاف باور کرایا گیا تھا لیکن باطن کو چھوڑ کر جب وہ ظاہر پر عمق سے سطح پر آیا تو یہاں بھی وہی سب کچھ تھا جس کی مذمت باطن میں کی گئی تھی۔ رنگ کا اسکول ہو، یا زبان کا، نسل و خون کا اسکول ہو، یا ملک اور وطن کا، کہاں اختلافات کی وہ قسمیں نہیں ہیں جن کا خواہ مخواہ الزام مذہب اور مذہب والوں کے عماموں میں باندھا گیا ہے

حقوق زوجین

(۵)

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لیے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور قانون سازی میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ (۲: ۲۷) وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (۲: ۲۷) وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (۵: ۱)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

۲۔ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ ... وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ (۲۷) وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ (۲۴: ۴) فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ (۴: ۴)

ان آیات سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو خود اپنا نکاح کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اور اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں لیکن عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء اور عزیز و قریب مردوں کی رائے کا دخل بھی ہے اور وہ اپنے نکاح کے معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الایم احق بنفسہا من ولیہا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور کسی کو اس پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں، اگرچہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (۴: ۴) وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ

وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (۴ : ۳) ، فَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ .... فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (۲ : ۳۱) ۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اُس تمتع کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ عورت یا تو اپنی خوشی سے معاف کر دے (فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ)۔

(۴) وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۔ (۴ : ۳) ۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (۴ : ۶) ۔

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ ان حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز کی مرتکب ہو۔

(۶) وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ (۲ : ۳۱) ۔

یہاں نفقہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی تعیین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائیگا مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

(۷) وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا (۴ : ۶) ۔

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے۔ اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت۔ دوسرے ضرب غیر مبرح یعنی ہلکی مار جو صرف انتہائی درجہ کے نشوز میں جائز ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا یعنی بغیر نشوز کے سزا دینا، یا کم درجہ کے نشوز پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی نشوز پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (۴: ۶)۔

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو تو ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک شخص عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے، اور دونوں حکم مل کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کریں۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوْا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں، اس لیے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔ (۲: ۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ قائم رکھ سکیں گے یا نہیں؟ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شئے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے۔ اور اس کے لیے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جا سکتی ہے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۲: ۲۹)۔

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (۲: ۲۹)۔

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لیے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے (فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ) جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو، وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ حسب ارشاد نبوی اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہونچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے: لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴: ۱۹)۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لیے نازل ہوی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدہ کی تعلیم دی گئی ہے، وہ یہ کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندہ کر معلق ہو جائے، یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ (۲: ۲۸)۔

اس آیت میں عورتوں کی اوسط قوت برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی چار مہینے تک وہ ضرار اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے، مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ (۲۴: ۱)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے، اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائیگا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

(۱۴) اِلَّا اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲: ۳۱)۔

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے، اور وہی اسے باندھنے اور کھولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنْ طَلَّقَهَا۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵: ۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲: ۲۷۹) "نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے"۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے، اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ اس کی شکایت اللہ اور رسول کے قانون پر پیش کی جائے گی اور اگر اس قانون کی نگاہ میں، اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کرکے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہار کی ایک جماعت نے بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں، اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس کے اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ۔ (۲: ۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی بائن۔

مسائل جزئیہ ان اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان سے ہر ایک اصل کے تحت آتے ہیں، یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصار کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضروریات و حالات زمانہ کے لحاظ سے از سر نو قانون اسلامی کی تدوین و توضیح ضروری ہے۔

ارتداد احدالزوجین موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کرلی ہے جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہوگئی ہے بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لیے مرتد ہوگئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر

عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اذا ارتد احد الزوجین وقعت الفرقۃ بغیر طلاق (جب زوجین میں کوئی مرتد ہوجائے تو فرقت بغیر طلاق[1] واقع ہوتی ہے) لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی رو کو روکنے کے لیے مشائخ بلخ وسمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بناء اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مرتد بن جاتی ہے، اس لیے اس حیلہ کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی:-

اولاً، اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کرسکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوئی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہوجائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجۂ آخر والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب سے فائدہ اٹھا کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہوجائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے، اس کو مسلمان مرد کے نکاح میں رکھنا تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً۔ جو عورت اسلام کے دائرہ سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہوسکتا ہے؟ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور اس حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ سب یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہوچکی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اسی نکاح پر قائم رہنے کے لیے مجبور

[1] مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر حرام ہوجاتی ہے مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کرسکے۔

کریگی جو اس سے بحالتِ اسلام، اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلہ میں مشائخ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علما کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہونگی جن کے عقیدہ میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لیے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے، مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کرسکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بیہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں مگر بند نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال کر ان قسمت کی ہاری ہوئی عورتوں کے لیے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے، اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈالکر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کی آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام کا تعلق ہے ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لیے موجبِ ضرر ہی ہو کجا کہ موجبِ ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی

ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکتا ہے۔

خیار بلوغ| قرآن مجید میں اگرچہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیا کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدہ کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیا کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بے اختیار رہے۔ بخلاف اس کے حضور نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے، چنانچہ ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنساء بنت خدام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا حضور نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضور نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرا دی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کر دے۔ اس پر اس نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ اجزت ما صنع ابی و لکن اردت ان اعلم النساء ان لیس الی الآباء من الامر شئ"	یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اسے میں نے منظور کر لیا میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور موطا میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:۔

الایم احق بنفسہا من ولیہا والبکر تستأذن فی نفسہا۔	بن بیاہی عورت اپنے ولی سے بڑھ کر اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

لاتنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن۔	شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔ اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جبتک کہ اس کا اذن نہ لیا جائے۔

ولایت اجبار یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا اور کوئی ولی کر دے تو کیا کسی حال میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو، ساقط ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں ہمارے فقہا نے یہ فتوی دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا، الّا یہ کہ باپ یا دادا کا سیّ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً وہ فاسق ہو یا بے حیا ہو، یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہو۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر ولایت اجبار حاصل ہے، اور ان کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ محض فقہا کے اس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے

لہ لغت میں ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

اس لیے لڑکی کے لیے ان کا کیا ہوا انکاح لازم ہونا چاہیے چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ فلا خیار لھما بعد بلوغھما لانھما کاملا الرای وافرا الشفقۃ فیلزم العقد بمباشرتھما کما اذا باشراہ برضاھما بعد البلوغ۔ لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا و رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔

اوّلاً، حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کمسنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کردیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا قبول کرنے کا اختیار رہے اس حدیث سے نابالغہ کے لیے خیار بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں اس لیے میرا کیا ہوا انکاح اس کے لیے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا یہ حق کلیۃً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جو اہمیت کو ملحوظ رکھکر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ اگر کسی کے کامل الرائے اور وافر الشفقت ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہو سکتی ہے، تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اسکے لیے ثابت کی جاتی ہے لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟

ثالثاً باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھکر ایک قیاس قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں جن سے وفور شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ہوتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفور شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کردیں اور

لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجبار خود ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو اپنے باپ یا دادا کے خلاف بدنیتی فسق و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر یا حماقت و بلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ اور یہ نہ صرف اس کے لیے مشکل ہے، بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مصالح کا اقتضاء ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

خیار بلوغ کی شرائط اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محل نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیار بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ یہ شرط صرف باکرہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لیے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد

جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، ان کو خیار فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط ابو حنیفہؒ نابالغہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیار فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کوئی نہیں کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں برے اور بھلے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رونما ہو اور آناً فاناً وہ ناقص الرائے سے کامل الرائے ہو جائے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اس وقت تک کے لیے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ باکرہ کو بھی سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لیے کوئی آخری مقدار مقرر نہیں کی گئی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لیے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی، مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا۔ کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا امرأة اصابت و رجل اخطأ۔ پس جہاں تک نفس تحدید کا تعلق ہے، قانون میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں، لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

حضور نے فرمایا :-

الزموا النساء الرجال ولا تغالوا فی المھور عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش کرو اور

مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراہم

من اودیتکم مازدتم (اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شائد تم اس سے

زیادہ مہر نہ باندھتے)

حضرت انس نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۶۰ درہم) پر نکاح کیا تو حضور نے فرمایا کانما

تنحتون الفضۃ من عرض ھذا الجبل۔ (گویا تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں

کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کو اختیار کرتے مگر آپ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے

زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی

زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر مؤجل کے طور پر لکھدی جاتی ہیں۔

مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے

وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے

لیے موجب فساد ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمایا ہے کہ۔

من تزوج امرأۃ بصداق ینوی ان جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح

لا یؤدیہ فھو زانٍ ومن ادان دینا کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کریگا، وہ

نیّتہ ان لا یقضیہ فھو سارق۔ دراصل زانی ہے" اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لیے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لیے غریب عورت معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۵۰ فی صدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لیے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مہر اگر معجل ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں لیکن اگر وہ موجل ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے، اور زر مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخالِ دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا قانون اگر بنا دیا جائے تو مہر موجل کا یہ سرتا پا عیوب سے بھرا ہوا طریقہ باسانی مسدود ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں۔ اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر دیں۔

نفقہ اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے، خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتویٰ کو اختیار کرنا پسند کیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو، یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھا رہنے پر مجبور کیا جائے۔ جب تک وہ کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصول قرض کی غیر ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف میں ڈالنا خلاف عدل معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بیاہی نہ ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت

دیتے ہیں، اور امام احمد حنبل کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرا دی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وبما انفقوا من اموالھم میں بیان کیا گیا ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دار قطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابوہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (۶۵: ۱)۔ لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لیے شرعاً کوئی مقدار معیّن نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ بلا شبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیے، لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابل تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانون اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے مقام بلند پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

ستم ناروا آیۂ کریمہ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ ..... فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا - (۴: ۶) کی رو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزار جسمانی ہو یا آزار لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت، اور ناقابل برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود لائسنس ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے۔

تحکیم اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے۔ وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں پھر دونوں حکموں کو مخاطب کر کے فرمایا "تمہارا کام کیا ہے، جانتے ہو؟ تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔" پھر عورت سے دریافت فرمایا، کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے۔ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر وہ ملا دیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ لیس ذالک لک، لست ببارح حتی ترضی بمثل ما رضیت بہ۔ تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔"

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو

تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ کیا جائے، جن میں تحکیم کے طریقہ، اور حکمین کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

(۴)

تالیف علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

۴۔ نماز اور قربانی دونوں ایک دوسرے پر مشتمل ہیں یعنی نماز ایک پہلو سے قربانی ہے، اور قربانی ایک پہلو سے نماز ہے۔ نماز کا قربانی ہونا واضح ہے، کیونکہ اوپر گذر چکا ہے کہ نماز بعینہٖ ذبح کی ایک تعبیر ہے۔ نیز یہ نفس کو تحمل مشقت اور ترک لذات کا خوگر بناتی ہے جو ذبح کی سمیت ہے، اس لیے اس کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ قربانی کا نماز ہونا محتاج تفصیل ہے۔ یہ بات گذر چکی ہے کہ قربانی کی حقیقت راہ الٰہی میں جان کی قربانی ہے۔ اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری صورت میں بعینہٖ نماز ہے۔ اس میں زبان اور ہاتھوں کے ذریعہ اقرار ایمان ہے۔ اس میں اسی ایمان کی تصدیق جان دیکر کی جاتی ہے۔ اسی لیے خدا کی راہ میں جان دینے کا نام شہادت ہے، نیز اس میں کمال درجہ خضوع و طاعت ہے، اس لیے نماز کی اصلی روح، اقرار توحید اور خضوع کی یہ سب سے زیادہ حامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام آداب بھی اس کے نماز ہونے کی شہادت دیتے ہیں، مثلاً

(۱) قربانی خانۂ کعبہ کے پاس ہوتی ہے، جو مرکز نماز ہے۔

(۲) اس کا آغاز بسم اللہ اللہ اکبر ہے۔

(۳) قربانی اور قربانی کرنے والے کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

(۴) اونٹوں کی قربانی میں قیام کی رعایت ہے، جس میں قیام نماز کی جھلک پائی جاتی ہے

(۵) مینڈھوں کی قربانی میں سجدہ کی رعایت ہے، جو سجدۂ نماز سے اشبہ ہے۔

پھر آغاز نماز کی دعا جو قرآن میں وارد ہے وہ یہ ہے:۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام ۔ ۷۹)	میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

نیز:۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۔ (انعام ۱۶۲ ۔ ۱۶۳)	بیشک میری نماز میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا:۔

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (صٰفٰت ۔ ۱۰۳) جب ان دونوں نے امر الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ یعنی ان کے ظاہر و باطن دونوں خدا کی طرف متوجہ ہوگئے، اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو سجدہ میں ڈال دیا۔

اسی طرح قربانی کے ذکر میں فرمایا:۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ (حج ۔ ۳۵)	اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ ان میں تمہارے لیے بھلائیاں ہیں پس ان پر درآں حالیکہ وہ صف بصف ہوں اللہ کا نام لو

یعنی جس طرح تم نمازوں میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہو، اسی طرح وہ بھی ذبح کے وقت صف بستہ

کھڑے کیے جائیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بیان میں، جو قربانی کے ذیل کی عبادت ہے، فرمایا:۔

وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔ اور وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درآنحالیکہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں

یعنی زکوٰۃ دیتے وقت ان کی ہیئت سے خشوع کا اظہار ہوتا ہے، متکبر اور طالب شہرت اغنیاء کی طرح تن کر نہیں دیتے۔

(۵) نماز اور قربانی دونوں ذکر الٰہی ہیں۔ نماز کا ذکر ہونا متعدد آیات سے واضح ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ۔ ۱۴) اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ۔ ۱۵) اور اس نے اپنے رب کے نام کو یاد کیا پس نماز پڑھی

باقی رہا قربانی کا ذکر ہونا سو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ (حج۔ ۳۴) اور اللہ کے نام کو یاد کریں، ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ (حج۔ ۳۷)۔ اسی طرح ان کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تم اس ہدایت پر جو اللہ نے تم کو بخشی ہے۔ اس کی بڑائی کرو۔

یعنی دین و توحید و اسلام کی ہدایت پر۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تکبیر کے ذریعہ ہم نماز میں ذکر الٰہی کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح قربانی کے وقت بھی کرتے ہیں۔

(۶) یہ دونوں (نماز اور قربانی) شکر ہیں۔ نماز کا شکر ہونا بالکل ظاہر ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ شکر ہی کے لفظ سے نماز کو تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ (بقرہ ۱۵۲) پس مجھکو یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھوں گا، اور

میاں شکر کرو، ناشکری مت کرو۔

سورہ فاتحہ نماز کی جان ہے، اور معلوم ہے کہ اس سورۃ کی بنیاد شکر پہ ہے۔ اب قربانی پر غور کرو! یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل مستغنی ہے۔ وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ۔ وہ کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں، اس نے جو نعمتیں ہم کو بخشی ہیں، ان میں سے ہم کچھ اس کی راہ میں محض اس اعتراف کے لیے قربان کرتے ہیں، کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت اور اس کے انعام کا فیضان ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کے وقت ہم کہتے ہیں:۔

"منک ولک" "تیری بخشی ہوئی نعمت اور تیری ہی راہ میں۔ اسی لیے فرمایا ہے:۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (حج۔۳۶) اسی طرح ہم نے ان کو مسخر کیا: تاکہ تم شکر کرو۔

اور جس طرح نماز اللہ کی تمام ظاہر و باطن نعمتوں پر ایک عام شکر ہے اسی طرح قربانی بھی محض منافع دنیاوی کا شکر نہیں ہے بلکہ عموم شکر کا وہی پہلو اس میں بھی مرعی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (حج۔۳۷) تاکہ تم کو جو ہدایت بخشی ہے۔ اس پر اللہ کی بڑائی کرو۔

،، یہ دونوں تقوی کی فرع ہیں جس سے آدمی کی امیدیں وابستہ ہیں، یا جس سے ڈرتا ہے، اس کو برابر یاد رکھتا ہے۔ اور نماز اسی ذکر کے قائم رکھنے کے لیے ہے۔ چونکہ بندہ کو خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے، اور اس کے غضب سے ڈرتا ہے، اس لیے وہ اس کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (انعام۔۷۲) اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور اس سے ڈرو، اور وہی ہے جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے۔

اب قربانی کو دیکھو! اللہ تعالیٰ نے بہائم پر انسان کو جو غلبہ اور تسلط دیا ہے، اس میں ایک قسم کی آقائی اور بندگی کی نمود تھی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اظہار خشوع اور اقرار بندگی کے

ذریعہ اس غرور کو مٹا دیا جائے، اور بندہ کی زبان پر شکر نعمت اور اقرار عبدیت کے ایسے کلمے جاری کئے جائیں، جن سے خدا کی ملکیت اور پروردگاری اور اس کی وحدت و یکتائی کا اظہار ہو۔ غور کرو! ان تمام امور میں تقویٰ کی کس قدر جلوہ گری ہے! پس چونکہ وہ ان تمام حقائق کا جامع تھا، اس لیے وہی قربانی کی حقیقت قرار پایا۔ بندہ تقویٰ ہی کی راہ سے قرب الٰہی کے مقام شرف تک پہونچتا ہے۔ اس لیے کوئی قربانی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک کہ اس میں تقویٰ نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (مائدہ ۲۷) اللہ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ ۱۹۷) اور تقویٰ کا زاد راہ لو، کیونکہ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔

تقویٰ کو زاد راہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ یہی قرب الٰہی کی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ یہ تقریب تقرب کے لیے ہے، جیسا کہ گیارہویں سبب میں ہم لکھیں گے۔ اس لیے تقویٰ کا زاد راہ ناگزیر ہوا۔

۸۔ یہ دونوں منازل آخرت میں سے ہیں۔ کیونکہ نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اس لیے اس میں معاد کی ایک جھلک ہے، گویا وہ خدا کے سامنے اپنی حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہے۔ یہ اشارہ مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ (بقرہ ۴۵-۴۶) بے شک وہ (نماز) گراں ہے، مگر ان خوف رکھنے والوں پر نہیں جن کو گمان ہے کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک دن اُس کی طرف لوٹنا ہے۔

جن کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے تمام اعمال و اقوال کی جوابدہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور معاصی سے تائب ہو کر اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں، اور حشر کے دن، خدا کے حضور کھڑے ہونے کی خشیت اور پستی دنیا میں ان پر طاری ہو جاتی ہے

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ۔ (نازعات ۸-۹) — دل اس دن مضطرب ہوں گے اور نگاہیں پست ہونگی۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ (مومنون ۱-۲) — ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں سرفگندہ ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (نور ۳۷) — ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔

یہ آیت بھی اسی کے مشابہ ہے:-

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (علق ۶ تا ۱۰)۔ — بے شک انسان سرکشی کرتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ اپنے کو مستغنی دیکھتا ہے، بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے، (یعنی جس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے وہ کیسے بے پروا ہوتا ہے) تم نے اس کو دیکھا! جو ایک بندہ کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن، جب ہم کو پکارے گا، ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگیں گے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ — جس دن وہ تم کو پکارے گا، تم اس کی حمد پڑھتے

وَتَظُنُّونَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا (اسرٰء) ہوئے اس کی طرف دوڑو گے اور خیال کرو گے کہ تم بہت کم ٹھیرے۔

اسی طرح نمازی نماز کی پکار کی طرف لپکتے ہیں اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ بھی نماز کی طرح رجوع الی اللہ ہے، جیسا کہ دوسرے اور تیسرے سبب کے بیان میں مذکور ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر ہم ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے۔

جس طرح بہائم کو خدا نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اسی طرح ہمارے اجسام کو بھی ہمارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ ایک متعین مدت تک کے لیے رفق اور حسن سلوک کے ساتھ، ہم ان کو اپنا مرکب بنائیں اور پھر ان کو خدا کے حوالہ کر دیں۔ انعام کے بارہ میں فرمایا:-

لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ (حج - ۳۳) تمہارے لیے ایک متعین مدت تک کے لیے ان میں منفعتیں ہیں، پھر ان کو خدا کے قدیم گھر کی طرف لیجانا ہے۔

پس جس طرح قربانی کے جانوروں کو ہم بیت اللہ کی طرف لے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے اجسام کو بھی لے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ (حج - ۲۷) اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، کہ آویں تمہارے پاس پیادہ پا اور لاغر اونٹوں پر جو آئیں گے گہرے راستوں سے۔

دیکھو! دونوں کی سمت سفر ایک ہی ہے۔ اور یہ اشتراک ہر چیز میں نمایاں ہے۔ جس طرح قربانی کے جانوروں کی ہم حرمت کرتے ہیں، اور ان کے لیے ایک مخصوص شعار قرار دیتے ہیں، بعینہ وہی معاملہ اپنے جسموں کے ساتھ کرتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ہم جانوروں کی طرح اپنے جسموں کو ذبح نہیں کرتے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانوروں کا فدیہ دیکر ان کو چھڑا لیتے ہیں، جس طرح اسمٰعیل کی

جان اُس چیز کے عوض میں چھڑالی گئی، جو ان کی قائم مقام بن کر قربان کی گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل کا ہدیہ ایک دوسری شکل میں قبول فرمایا کہ حضرت اسمٰعیل کو اپنے گھر کی خدمت کے لئے مخصوص فرمایا، اسی طرح ہم بھی اپنے جسموں کو فدیہ دیکر چھڑا تو لیتے ہیں، لیکن وہ ہم کو واپس نہیں کر دیے جاتے، بلکہ ہماری امانت میں دیدئے جاتے ہیں۔ تاکہ جب ضرورت پیش آئے ہم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر سکیں۔ قرآن مجید میں، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (توبہ۔ ۱۱۱)	بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ یہ ایک سچا اور پکا عہد ہے اور توراۃ انجیل قرآن میں مذکور ہے، جنہوں نے اللہ سے اپنے عہد کو پورا کیا ان کے لیے ہمارا پیام یہ ہے کہ اپنے اس معاملہ کی جو تم نے کیا ہے خوشخبری حاصل کرو۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسلام کی بیعت کے بعد ہم خدا کے ہاتھ بک جاتے ہیں، اور اسی عہد کی تجدید کے لیے ہم اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں، اور حجر اسود کو ہاتھ لگا کر اس کا از سرنو اقرار کرتے ہیں یہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد کی توثیق اور ہمارے، اللہ کی راہ میں قربان ہونے کا اعتراف ہے پھر حج کا اجتماع ہمارے حشر کے میدان میں کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اس پہلو سے نماز، حج اور قربانی، ان تینوں کو معاد سے قریبی نسبت ہے۔

۹۔ یہ دونوں ابواب صبر میں سے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے

وعدہ پر پورا بھروسہ کرکے نماز کی مداومت کرتا ہے، اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی سی ہے، جو شب و روز پودے کی نگہداشت کرتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، اس کو پانی دیتا ہے، اور اس کے پھل کا منتظر ہے، اور دوسروں کی غفلت و سستی اس کی اس سرگرمی و خود فراموشی میں کوئی ضعف نہیں پیدا کرتی۔ لوگ اس کی امید موہوم پر ہنستے ہیں لیکن خدا کی شکر گذاری و طاعت کے جادۂ مستقیم سے اس کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں غیر معمولی رسوخ عزم اور انجام کار کی کامیابی پر غیر متزلزل یقین کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتیں۔ انہی وجوہ سے قرآن مجید نے صبر اور نماز کو متعدد آیات میں ایک ساتھ ذکر کیا ہے:۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ اور صبر و نماز کے ذریعہ مدد چاہو۔

اوپر ہم نے جن امور کی تشریح کی ہے، مندرجہ ذیل آیت میں ان کی طرف نہایت واضح اشارات ہیں:۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْــَٔـلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰهٰ ۱۳۰ تا ۱۳۲)	پس ان کی باتوں پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھو، سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے وقتوں میں اس کی تسبیح پڑھو، اور دن کے اطراف میں تاکہ تم خوش ہو جاؤ اور تم نہ دیکھو اس زینت دنیا کی طرف جو ہم نے ان کی بعض جماعتوں کو بخشی ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ ان کا امتحان کریں۔ تمہارے رب کی روزی زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے! اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو ہم تم سے روزی نہیں مانگتے ہم تم کو روزی دیتے

انجام کار کی کامیابی تقوی کے لیے ہے۔

دوسری جگہ ہے:-

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (رعد - ۲۲)

اور جو اپنے رب کی رضا کی طلب میں ثابت قدم رہے اور نماز قائم کی۔

نیز فرمایا:-

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ (غافر ۵۵-۵۶)

پس ثابت قدم رہو بےشک اللہ کا وعدہ حق ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھو۔ بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو جھگڑتے ہیں ان کے سینوں میں محض ایک گھمنڈ ہے جو پورا نہ ہوگا پس اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ کے عہد پر قائم رہنا، اس پر پورا بھروسہ کرنا، اس کی راہ میں مصائب جھیلنا اور عاقبت کار کی کامیابی کا منتظر رہنا کتنی کٹھن راہ ہے اور اس میں ہر قدم پر صبر و ثبات کی کتنی ضرورت ہے۔

یہی حال قربانی کا ہے۔ یہ اس عظیم الشان صبر کی تعلیم پر مبنی ہے، جو ابراہیم خلیل نے کیا تھا۔ بڑھاپے تک خدا نے ان کو کوئی اولاد نہیں بخشی لیکن جب بخشی اور ایسی اولاد بخشی جس کے حسن و باطن اور حسن ظاہر نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، تو اسی اولاد کو اپنی راہ میں قربان کرنے کا حکم دیدیا۔ کتنا کٹھن امتحان تھا! لیکن حضرت ابراہیم کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی، بلکہ وہ خدا کے شکر گذار ہوئے کہ اس نے ان سے وہ چیز مانگی جو ان کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب بھی

اس سے معلوم ہوا کہ نماز پر ہمارا صبر اسی طرح کا صبر ہے جس طرح ہم مصیبت کے تحمل کے وقت کرتے ہیں۔ نماز اور خدا کی جانی و مالی آزمائشوں کے وقت صبر میں جو تعلق ہے اس کو آیت ذیل بے نقاب کر دیتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۔ (بقرہ ۱۵۳-۱۵۸)

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے ہم تمکو کسی قدر خوف، بھوک، مال جان اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور ثابت قدموں کو بشارت دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں: ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں اور رحمت ہے اور وہی لوگ راہ یاب ہیں بیشک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے اپنی خوشی سے نیکی کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے

آیت میں مروہ کا بھی تذکرہ ہے، اور ہم اس آیت کی تفصیل کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، اب غور کرو! اس آیت میں نماز

صبر، جہاد، مصائب اور مقام قربانی کا تذکرہ ایک ساتھ ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایک جامع حقیقت نے ان سب کا رشتہ ایک ساتھ جوڑ دیا ہے۔

۱۰۔ ان دونوں میں اس امر کا اقرار و اعتراف ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، اور تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوی ہیں۔ نماز میں یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے، اس کی بنیاد ہی شکر اور اقرار ربوبیت پر ہے۔ غور کرنے سے یہی بات قربانی میں بھی معلوم ہوتی ہے، یہ بھی زبان حال سے گویا اسی حقیقت کا اظہار ہے، ہم قربانی کر کے گویا اقرار کرتے ہیں کہ: ہر چیز خدا کی ملکیت ہے: تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوی ہیں۔ ہماری جانیں اور ہمارے مال سب اللہ کے خزانہ جود و فیض سے ہم کو نصیب ہوے ہیں، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو خدا کے حوالہ کریں اور اس کی طاعت و بندگی کی راہ میں ان کو استعمال کریں یہ ہم کو اسی لیے بخشے گئے ہیں کہ ہم اس کے فضل و احسان کی شکرگزاری کریں، اور جہاں اس کی مرضی ہو وہاں ان کو قربان کر دیں، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے، اس لیے ہم صرف اسی کی بندگی کرتے ہیں، اور اسی کے حضور سجدے کرتے ہیں، اور جو کچھ اس کا بخشا ہوا ہے، اسی کے دربار میں پیش کرتے ہیں، وہی پیدا کرنے والا اور وہی بخشنے والا ہے۔ اس نے ہماری زبانوں پر انا للہ و انا الیہ راجعون کا اقرار جاری کیا یعنی ہم اور ہماری تمام ملکیت خدا کے لیے ہے۔ حکومت اور احسان صرف اسی کی صفات ہیں، ہمارے لیے صرف اطاعت اور شکرگزاری ہے جس طرح ملکیت مالک کی طرف لوٹتی ہے، اسی طرح ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے کسی چیز سے یہاں تک کہ اپنے نفس سے متمتع ہونا بھی اس وقت تک جائز نہ ہوا جب تک ہم اس کا نام لے کر اس کی بخشش کا اقرار نہ کریں۔ اسی اصل عظیم کی تعلیم کے لیے اس نے ہمارے لیے قربانی کا فریضہ ٹھیرایا تاکہ خدا نے جو انعام و بہائم ہمارے لیے مسخر کیے ہیں ہم ان کو اس کے نام پر قربان کریں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (حج ۳۴) — اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تاکہ جو چوپائے ان کو روزی کئے ہیں، ان کو اللہ کے نام پر قربان کریں۔

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (حج ۳۷) — اسی طرح خدا نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ خدا نے تم کو جو ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو۔

حیوانات پر انسان کو خدا نے جو اختیار و تصرف بخشا ہے، اس میں آقائی اور بندگی کی شان پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ان کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ضروری کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں بھی اس نے اپنا ایک حق رکھا تاکہ ہم یہ بات بھول نہ جائیں کہ یہ خدا کی بخشش سے ہم کو ملی ہے۔ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ۔ اور جب پھل آئے تو ان کا پھل کھاؤ اور کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔ چونکہ ہمارے قبضہ میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے، اس لیے اسراف ناجائز ہوا۔ اور چونکہ حضرت ابراہیم نے خدا کی ملکیت کی سب سے بڑی شہادت دی کہ اپنی جان اور اپنے محبوب لخت جگر کو اس کی راہ میں پیش کر دیا۔ اس لیے قربانی کے بیان کے لیے انہی کا بہترین نمونہ مثال قرار دیا گیا کہ خدا کی امانت خدا کے حوالہ کرنے کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں تھی۔

۱۱۔ یہ دونوں تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ نماز کی سب سے زیادہ نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے، جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے، وہ دائیں بائیں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس لیے نماز نہ صرف ذریعہ تقرب بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے: واسجد واقترب (اور سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ) اس لیے نماز راس العبادات قرار پائی۔ میرے خیال میں صلوٰۃ کا اصلی مفہوم قربت قریبہ، کسی شئے کی

طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا ہے، اسی لیے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا، جو آگ میں گھس جائے۔

بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی مضمر ہے۔ قربانی کرنے والا اپنی قربانی ایسی جگہ لاتا ہے، جو اس کے خیال میں، خدا کی طرف سے اس عبادت کیلیے مخصوص اور مقدس ہوتی ہے اسی وجہ سے قربانی کے لیے ایک مخصوص و متعین جگہ قرار پائی۔ یہود کے یہاں بیت المقدس کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے جس طرح تمام زمین کو مسجد ہونے کا شرف حاصل ہوا اسی طرح قربانی بھی ان کے لیے ہر جگہ جائز ہوئی تاہم جس طرح مسجد کی نماز کو فضیلت حاصل ہے اسی طرح قربان گاہ پر قربانی کرنا افضل ہے۔ حضرت ابراہیم کی قربانی کے لیے اللہ تعالی نے ایک جگہ متعین فرمائی تھی، اور یہی جگہ ہمارے لیے بھی مخصوص ہوئی چنانچہ جس طرح ہم انکی مسجد کیلیے خدا حاضر ہوتے ہیں، اسی طرح اپنے قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی قربان گاہ پر لے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد ہمارے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرنا ہے کہ ہماری حیثیت غلاموں اور چاکروں کی ہے جو لبیک کہتے ہوئے آقا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، اور اس کی خوشنودی اور اپنی بندگی کے اقرار کے لیے اپنی قربانیاں اس کے حضور میں پیش کرتے ہیں پس جس حقیقت کو پیش نظر رکھکر صلوٰۃ کو صلوٰۃ کہا گیا اسی حقیقت کی رعایت سے قربانی کے لیے قربانی کا لفظ اختیار کیا گیا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا:

سمنوا ضحایاکم فانہا مطایاکم۔ اپنی قربانیوں کو فربہ کرو، کیونکہ وہ تمہاری سواریاں ہیں اس میں بھی اس حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اونٹ کی قربانی اس امت کے مخصوصات میں سے ہے۔ (دیکھو فصل ثانی)۔

۱۲ نماز اور قربانی عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم اور فطرت انسانی میں

سب سے زیادہ راسخ ہیں۔ سجدہ رکوع اور نذر اظہار بندگی کے وہ ہر دلعزیز ذرائع ہیں، جو ہر قوم وملت میں عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی، اس نے کسی روح یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان کو معبود بنایا ہو، عام رہے ہیں۔ بلاشبہ مہذب اور وحشی قوموں برحق اور گمراہ جماعتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ان کی نمازوں اور قربانیوں میں بھی بدرجہ اتم نمایاں رہتا ہے۔ تاہم نماز اور قربانی کی مقبول، محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل میں خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو ہر جماعت میں پائی گئی ہے جس طرح معبود کے ایک عام مفہوم میں باہمدگر متفق ہونے کے باوجود خود معبود کے بارے میں ان کے آرار و معتقدات نے الگ الگ راہیں اختیار کریں، اسی طرح ان عبادتوں کے اشکال وصور بھی ہر ایک کے یہاں مختلف سانچوں میں ڈھل گئے لیکن ایک مشترک حقیقت پر اتفاق باقی رہا۔ باقی عبادات کے بارے میں تم کو یہ اتفاق رائے نظر نہیں آئے گا۔

پہلے سبب کی تفصیلات کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایمان و اسلام تمام کائنات کو محیط ہیں، اور نماز و قربانی انہی دونوں کی صورتیں ہیں۔ اب مذکورہ بالا حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد تم پر یہ راز بھی کھل جائے گا کہ دین و عبادت کی راہ میں سب ایک ہی نقطے سے چلے تھے۔ لیکن اوہام وظنون اور اغراض واہوا نے خلط مبحث کر کے ان کو بے شمار راہوں پر ڈال دیا پس یہ اختلاف جو آج نظر آ رہا ہے، افراط و تفریط اور افساد و اختلاط کا نتیجہ ہے حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔

تفسیر سورۃ النصر

از جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی

اس سورۃ کا نام سورۃ النصر ہے۔ اس میں تین آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ مدینہ منورہ میں اتری ہے۔ قریش اور دیگر قبائل عرب کا قاعدہ تھا کہ ماہ ہائے ذی القعدہ۔ ذی الحجہ محرم اور ماہ رجب میں امن و صلح رہتی۔ حج کرنے والوں کو کوئی نہ روکتا نہ ستاتا۔ ان مہینوں کو اشہر حُرُم کہتے تھے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حج کا ارادہ کیا تو کفار نے خلاف قاعدۂ عرب حضرت اور آپ کے اصحاب کو حج سے مقام حدیبیہ روکا۔ اس پر سب نے آپکے ہاتھ پر آخر وقت تک جنگ کرنے کے لیے بیعت کرلی۔ بڑی گفت وشنید کے بعد صلح ٹھیری۔ شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ دس سال تک باہم جنگ نہ ہو۔ بنی بکر کفار قریش کے حلیف رہیں گے۔ اور بنی خزاعہ رسول خدا اور مسلمانوں کے حلیف۔ ایک دفعہ بنی بکر و بنی خزاعہ میں لڑائی ہوگئی۔ کفار قریش نے اپنے حلیفوں کی مدد کی اسلیے رسول خدا صلعم کو بھی ضرور ہوا کہ اپنے حلیفوں کی مدد فرمائیں آپکے ہمراہ رکاب سعادت مدینہ منورہ سے ۱۰ ہزار سپاہی نکلے۔ راستہ میں دو ہزار سپاہی اور آکر مل گئے۔ جملہ ۱۲ ہزار کی فوج سے حضرت نے دفعتًہ مکۂ شریف کا محاصرہ کرلیا فرمان رحمت نشان جاری ہوا۔ جو ابوسفیان سردار قریش کے گھر میں پناہ لے اس کو امان جو مسجد الحرام یعنی مسجد کعبۃ اللہ شریف میں رہے اس کو امان جو ہتیار ڈالدے اس کو امان۔ عربوں کا خیال تھا کہ مکۂ معظمہ پر کسی باطل پرست کا قبضہ نہیں ہوسکتا۔ جب مکۂ معظمہ پر حضرت کا قبضہ ہوگیا تو حضرت کے پیغمبر ہونے میں ان کو شک وشبہہ نہ رہا۔ جوق جوق آنے لگے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی بعض کا قول ہے کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں قبل فتح مکہ ہی نازل ہوچکی تھی۔ اس قول کے مطابق اس سورت میں فتح مکہ کی

پیش گوئی ہے۔

اِذَا۔ جب۔ حرف شرط ہے۔ اِذَا یقینی امر پر ہوتا ہے۔ اور اِن مشکوک بات پر۔

نَصْر۔ مدد۔ دشمن کے مقابل میں تائید۔ لفظ مدد میں بار بار اعانت اور اس کا دوام ملحوظ ہے۔ اعانت سے کام میں سہولت ہوتی ہے۔ تائید میں قوت مدنظر ہے۔

الفتح۔ کھولنا۔ دشمن کے قلعہ کا دروازہ کھولکر داخل ہونا۔ فتح ملک کی ہوتی ہے۔ ظفر دشمنوں پر ہوتی ہے۔ ال کئی قسم پر ہے (۱) عہد خارجی یعنی مخصوص و معین۔ اس سے جو قضیہ و جملہ بنتا ہے شخصیہ و مخصوصہ ہوتا ہے۔ جیسے جاء الرجل۔ فلاں شخص آیا۔ (۲) لام طبیعت جیسے الرجل خیر من المرأۃ۔ یعنی مرد کی طبیعت عورت کی طبیعت سے بہتر ہے اس سے قضیہ طبیعیہ بنتا ہے۔ (۳) جنس کا ال جو کئی پر صادق آتا ہے۔ اور اس سے افراد مقصود ہوتے ہیں جیسے الانسان حیوان۔ یعنی جنس انسان پر جنس حیوان صادق آتی ہے اس سے قضیہ مہملہ بنتا ہے۔ (۴) عہد ذہنی جنس میں سے کوئی ایک فرد جیسے ادخل السوق۔ بازار جاؤ یہاں کوئی خاص بازار مراد نہیں ہے۔ اس سے قضیہ جزئیہ بنتا ہے۔ (۵) استغراق جمیع افراد۔ کل۔ ہر ایک۔ جیسے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ ہر شخص نقصان میں ہے۔ بجز ایماندار کے۔ اس سے قضیہ کلیہ بنتا ہے۔

النصر اور الفتح سے مطلق نصر و فتح مراد ہے تو ال جنس کا ہے۔ اگر النصر اور الفتح سے فتح و نصرت مکہ مراد ہے تو ال عہد خارجی کا ہے۔

جَآءَ کہا گیا، حضر یا حصل نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خدا کی فتح و مدد تقادیر الہیہ سے اوقات معینہ پر پہنچتی ہے۔

رایت، رؤیۃ۔ آنکھوں سے دیکھنا۔ رویا خواب دیکھنا۔ رویۃ۔ سمجھنا۔ جاننا ...... رأیا۔ مناسب جاننا۔

الناس۔ لوگ، اس لفظ کی تحقیق سورۃ الناس میں ہو چکی ہے۔

یدخلون۔ شل نصر داخل ہوتے ہیں۔ دخل البیت اور فی البیت دونوں درست ہیں مگر دخل الدین نہیں آتا۔ رأیت کو اگر ابصرت دیکھنے کے معنی میں لیں تو یدخلون حال ہوگا کیونکہ اس معنے پر اس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔ اور اگر رأیتَ علمتَ اور جاننے کے معنے میں ہو تو یَدخُلونَ بتاویل الدخول کے دوسرا مفعول ہوگا۔

سبح۔ پاکیزگی بیان کر۔ سبح الرجل دور ہوگیا۔ سبح القوم لوگ منتشر ہوگئے سبح اللّٰہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کی تنزیہ کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تمام صفات عیوب مخلوقات سے دور اور پاک ہونا بیان کیا۔

حمد۔ شکر۔ مدح وثنا۔ راضی ہونا۔ حق ادا کرنا۔ خدائے تعالیٰ کی ذات مقدسہ کی تسبیح وتنزیہ کی جاتی ہے اور اس کے اسماء وصفات۔ کمالات اور انعامات پر حمد کی جاتی ہے۔ اس لیے حمد کے ساتھ اسم رب لایا گیا ہے جو مسلسل متواتر احسانات پر دلالت کرتا ہے۔

وَاستَغفِرہُ۔ غفر۔ ڈھانکنا۔ چھپانا۔ مغفر۔ خود لوہے کی ٹوپی جو سر کو چھپاتی ہے مغفرۃ گناہ کو یا خود شخص کو دامن رحمت میں چھپانا۔ مغفرۃ میں گناہ چھپایا جاتا ہے مگر رہتا ہے عفو میں گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں، ان کے گناہ مغفرت سے دامن رحمت میں چھپا دیے جاتے ہیں جن لوگوں نے گناہ کیے ہی نہیں، ان کی مغفرت اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دامن رحمت میں اس طرح چھپا لیتا ہے کہ گناہ کی رسائی ان تک ہو ہی نہیں سکتی۔ تو اگر وہ شخص پیغمبر ہو تو اس کو معصوم کہتے ہیں۔ اور ولی ہو تو اس کو محفوظ کہتے ہیں پیغمبر کی عصمت کی ضرورت ہے اور ولی کی حفاظت مالک کی عنایت ہے۔ کرامت ہے۔ انبیا اور رسل کے استغفار کی متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) امت کی جانب سے بحیثیت وکیل اور نمایندہ امت کے استغفار۔ (۲) اپنے ماقبل کی حالت جو موجودہ ترقی شدہ حالت کے لحاظ سے ایک نوع کا گناہ معلوم ہوتی ہے، اس سے استغفار۔ (۳) پیغمبر کو ترک اولیٰ پر سرزنش کی جاتی ہے، اور وہ اسپر استغفار کرتے ہیں۔ (۴) وحی کا انتظار نہ کرکے اعتبار و اجتہاد سے کام لینے پر بھی سرزنش ہوتی ہے اور پیغمبر اس سے استغفار کرتے ہیں۔ (۵) بعض دفعہ ہجوم افکار ابر کی طرح دل پر چھا جاتے ہیں اور پیغمبر یا اولیا جن کا کام ہے تحت اقتدار الٰہیہ رہنا، فکر کرنے سے استغفار کرتے ہیں۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ۔

جب اللہ کی فتح و نصرت آگئی اور مکہ فتح ہوگیا جس کی بظاہر کوئی امید تھی ہی نہیں۔ اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج فوج، قبیلہ قبیلہ داخل ہو رہے ہیں تو تم ذات پاک پروردگار کی تنزیہ بیان کرو۔ جو ان اصنام اور بتوں کی پلیدی سے پاک ہے اپنے پروردگار کے احسانات کا عموماً اور خصوصاً فتح مکہ اور نشر اسلام کا شکر ادا کرو۔ اور اس سے دعائے مغفرت کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ تاب مثل تعالیٰ رجوع کیا۔ پلٹا۔ لوٹا۔ توّاب بہت رجوع کرنیوالا۔ ترجمہ بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحمت کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جب یہ سورت اتری تو حضرت عباس رونے لگے۔ وہ سمجھ گئے کہ فرض رسالت پورا ہوچکا اب دنیا سے حضرت کے پردہ کرنے کا وقت آگیا اور ہوا بھی یہی کہ تھوڑی مدت میں آپنے دنیائے فانی پر آخرت جاودانی کو ترجیح دی۔ لا الٰہ الا اللہ الحق المبین محمد رسول اللہ الصادق الامین۔

رسائل و مسائل

سُود، پردہ، طلاق اور مہر

(۲)

اشاعت گذشتہ میں مسائل مندرجہ عنوان کے متعلق ڈاکٹر سیادت علی صاحب کے بیانات پر ایک مجموعی نظر ڈال کر صرف یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ناکافی تحقیق اور ناکافی غور و خوض پر مبنی ہے۔ اب ہم ان میں سے ایک ایک پر جدا جدا بحث کر کے یہ بتائیں گے کہ اس کے متعلق اسلام کی حقیقی تعلیم کیا ہے اور مسلمانوں کی جن مشکلات کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں بیان کیا ہے ان کو کس طرح شریعت کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے۔

۱- سُود

عام طور پر سود کے متعلق اسلامی قانون کے احکام کو سمجھنے میں جو غلطی واقع ہو رہی ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا، درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہو گیا ہے جس کی بنیاد "سرمایہ داری" کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت نہ صرف عملاً ہم پر محیط ہے بلکہ ہمارے دل و دماغ پر بھی اس کے اصول و نظریات چھا گئے ہیں۔ اس لیے جب کسی معاشی مسئلہ پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو سرمایہ داری کا نقطۂ نظر ہے۔ ہماری بحث و تحقیق کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ہم پہلے معاشیات کے سرمایہ دارانہ نظریات اور اصولوں کو مان لیتے ہیں اور اس کے بعد کسی معاشی طریقہ کے جواز و عدمِ جواز

گفتگو کرتے ہیں لیکن اگر تھوڑی سی سمجھ سے کام لیا جائے تو یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تحقیق کا یہ طریقہ اصلاً غلط ہے۔ اسلام کا نظم معیشت اپنے نظریہ اور اپنے اصول میں سرمایہ داری کے نظم معیشت سے بالکل مختلف ہے، دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں، دونوں کی روح جدا جدا ہے، دونوں کے مناہج علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ اب اگر کسی مسئلہ کے متعلق سرمایہ داری کے اصول و نظریات کو تسلیم کرکے اسلام کے معاشی احکام میں سے کسی حکم پر نظر ڈالی جائے گی تو لامحالہ یا تو وہ بالکل ہی غلط نظر آئے گا، یا اس میں ایسی ترمیم کردی جائے گی جس سے وہ اسلامی قانون کے اصول سے ہٹ کر بالکل سرمایہ داری کے قالب میں ڈھل جائیگا اور اس میں نہ اسلامی روح باقی رہے گی، نہ اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد اس سے حاصل ہوسکیں گے، اور نہ وہ اپنے جوہر میں حقیقۃً ایک اسلامی حکم ہوگا۔

یہی بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے سود کے معاملہ میں ہمارے جدید معاشی مفکرین اسلامی احکام کو سمجھنے اور ان کے اغراض و مصالح کا ادراک کرنے میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے چلے جارہے ہیں وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ اسلام کا معاشی نظام کن اصولوں پر قائم کیا گیا ہے اس کے مقاصد کیا ہیں۔ اس کی روح کیا ہے۔ سود کو اس نے کیوں حرام قرار دیا ہے۔ سودی لین دین کی مختلف اشکال میں علت حرمت کیا شئے ہے اور جن معاملات میں یہ علت پائی جاتی ہے ان کو اسلامی نظم معیشت میں کھپا دینے سے کیا قباحت واقع ہوتی ہے ان تمام اساسی امور سے بیگانہ ہوکر جب وہ کلیتہً سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سود کے متعلق اسلامی قانون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کو درحقیقت سود کی حرمت کے لیے کوئی دلیل ہی ہاتھ نہیں آتی کیونکہ سود تو سرمایہ داری کی جان اور اس کی روح رواں ہے، اس کے بغیر سرمایہ داری کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، اور کسی ایسے نظام معاشی کا سود سے خالی ہونا غیر ممکن ہے جس کی عمارت سرمایہ داری کے اصولوں پر قائم ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ علمی اور عملی حیثیت سے یہ حضرات سرمایہ داری کے پیرو ہیں، اعتقاداً اسلام کے بھی پیرو ہیں، اور قصداً اس کے دائرے سے نکلنا نہیں چاہتے۔ یہ اعتقاد کی بند

ان کو مجبور کرتی ہے کہ سود کی حرمت سے انکار نہ کریں مگر ان کا علم او عمل ان کو مجبور کرتا ہے کہ سود کے متعلق اسلامی احکام کی بندشوں کو توڑ دیں۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش ایک مدت سے جاری ہے اور اب اس میں مصالحت کی آسان صورت یہ نکالی گئی ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ سود ایک اسم بے مسمّٰی ہونے کی حیثیت سے تو بدستور حرام کا حرام رہے، مگر نظام سرمایہ داری میں اس کے جتنے مسمّٰی پائے جاتے ہیں، وہ قریب قریب سب حلال ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کے خلاف ان کو سرمایہ داری کے اصولوں سے کوئی دلیل ہاتھ آتی ہے وہ مہاجنی سود (یوژری) ہے لیکن اس کو بھی کلیتہً مسدود کر دینے کی کوئی وجہ وہ نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک ضرورت صرف اس کی تحدید کی ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ سود کی فی صدی شرح ناقابل ادائے ہو اور کسی حال میں سود در سود (اضعافاً مضاعفۃً) تک نوبت نہ پہنچے!

یہ ایک دھوکہ ہے جس میں یہ حضرات بغیر سمجھے بوجھے مبتلا ہو گئے ہیں۔ بیک وقت دو مخالف سمتوں میں سفر کرنے والی کشتیوں پر سوار ہونا کسی مرد عاقل کا کام نہیں ہو سکتا اگر بے خبری کی وجہ سے اس نے ایسا کیا بھی ہو تو ہوشمندی کا اقتضا یہ ہے کہ جونہی اس کو اپنی اس غلطی پر تنبہ ہو وہ اپنے لیے دونوں کشتیوں میں سے ایک کو پسند کر کے دوسری کشتی سے فوراً پاؤں کھینچ لے۔ سود کے حلال و حرام ہونے کی بحث اور اس کے حدود کی تعیین تو بعد کی چیز ہے۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ اسلامی نظم معیشت اور سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے اصول اور روحی فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں اور قرآن و حدیث کے احکام پر غور کر کے ان اصول و قواعد سے باخبر ہو جائیں جن پر اسلام نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک متوسط نظم معیشت قائم کیا ہے۔ اس تحقیق سے آپ پر خود بخود منکشف ہو جائیگا کہ اسلام جس ڈھنگ پر انسان کے معاشی معاملات کی تنظیم کرتا ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ سود کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ سرے سے اس نظریہ اور اس ذہنیت اور ان معاشی

حالات ہی کا استیصال کر دیتا ہے جن کی وجہ سے سودی معاملات کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں اس کے بعد آپ کے لیے ناگزیر ہوگا کہ دو راہوں میں سے ایک راہ انتخاب کریں۔ ایک راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصول معاشیات کو رد کر کے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے اصولوں پر ایمان لے آئیں۔ اس صورت میں آپ کو اسلام کے اصول اور احکام میں ترمیم کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑے گی۔ بلکہ آپ کے لیے سیدھا اور صاف راستہ یہ ہوگا کہ اس کے اتباع سے انکار کر دیں۔ دوسری راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصول معاشی کو تو صحیح سمجھیں اور سود کو اس کی تمام صورتوں کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت حرام جانیں، مگر سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے گھر جانے کے باعث اپنے آپ کو اس حرام چیز سے محفوظ رکھنے میں قاصر پائیں۔ اس صورت میں آپ سود کھانا اور کھلانا چاہیں تو کھائیے اور کھلائیے۔ کیونکہ ہر گناہ کرنے کا آپ کو اختیار حاصل ہے۔ مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ جرأت آپ کبھی نہیں کر سکتے کہ سود کو حلال کر کے کھائیں یا کھلائیں، اور اپنے ضمیر پر سے کل حرام کے بار کو ہلکا کرنے کے لیے اس چیز کو پاک کرنے کی کوشش کریں جس کو خدا اور اس کے رسول نے ناپاک قرار دیا ہے۔ ایک شخص حق رکھتا ہے کہ علانیہ اسلام کے قانون کو رد کر کے کسی دوسرے قانون کی پیروی اختیار کرے اور بدرجۂ آخر یہ حق بھی اس کو حاصل ہے کہ اسلامی قانون کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ماتحت ایک گنہگار بندہ بن کر رہنا پسند کرے، یا نامساعد حالات میں مجبوراً ایسا بن جائے۔ لیکن کسی حال میں یہ حق تو کسی کو بھی نہیں پہنچتا کہ اسلامی قانون کو جس غیر اسلامی قانون سے چاہے بدل دے اور پھر دعویٰ کرے کہ یہ بدلا ہوا قانون ہی دراصل اسلام کا قانون ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان مباحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

نظام سرمایہ داری | نظام سرمایہ داری کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا تنہا مالک ہے، اس کی کمائی میں کسی کا کوئی حق نہیں اس کو پورا اختیار ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اور وہ حق رکھتا ہے کہ جس قدر وسائل ثروت اس کے قابو میں آئیں ان کو روک رکھے اور اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اُن کو صرف کرنے سے انکار کر دے۔ یہ نظریہ اس خود غرضی سے شروع ہوتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اور آخر کار اس انتہائی خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کی تمام ان صفات کو دبا دیتی ہے جن کا وجود انسانی جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ اگر اخلاقی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم ثروت کا توازن بگڑ جائے، وسائل ثروت رفتہ رفتہ سمٹ کر ایک زیادہ خوش قسمت یا زیادہ ہوشیار طبقہ کے پاس جمع ہو جائیں اور سوسائٹی عملاً دو طبقوں میں تقسیم ہو جائے، ایک مالدار، دوسرا نادار۔ مالدار طبقہ تمام وسائل ثروت پر قابض و متصرف ہو کر ان کو محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے اور اپنی دولت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو جس طرح چاہے قربان کر دے۔ رہا نادار طبقہ تو اس کے لیے وسائل ثروت میں سے حصہ پانے کا کوئی موقع نہ ہو الا یہ کہ وہ سرمایہ دار کے مفاد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے زندگی بسر کرنے کا کم سے کم سامان حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظم معیشت ایک طرف ساہوکار، کارخانہ دار، اور زمیندار پیدا کرے گا، اور دوسری طرف مزدور، کسان اور قرضدار۔ ایسے نظام کی عین فطرت اس کی مقتضی ہے کہ سوسائٹی سے ہمدردی، اور امداد باہمی کی اسپرٹ مفقود ہو۔ ہر شخص بالکلیہ اپنے ذاتی وسائل پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ کوئی کسی کا یار و مددگار نہ ہو۔ محتاج کے لیے معیشت کا دائرہ تنگ ہو جائے سوسائٹی کا ہر فرد بقائے حیات کے لیے دوسرے افراد کے مقابلہ میں معاندانہ جدوجہد سے زیادہ

زیادہ وسائل ثروت پر قابو پانے کی کوشش کرے، اپنے مفاد کے لیے اُن کو روک رکھے، اور صرف ازدیاد ثروت کے لیے انہیں استعمال کرے پھر جو لوگ اس جد و جہد میں ناکام ہوں یا اس میں حصہ لینے کی قوت نہ رکھتے ہوں ان کے لیے دنیا میں کوئی سہارا نہ ہو۔ وہ بھیک بھی مانگیں تو ان کو بہ آسانی نہ مل سکے۔ کسی دل میں ان کے لیے رحم نہ ہو کوئی ہاتھ ان کی مدد کے لیے نہ بڑھے۔ یا تو وہ خودکشی کرکے زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کریں، یا پھر جرائم اور بے حیائی کے ذلیل طریقوں سے پیٹ پالنے پر مجبور رہوں۔

سرمایہ داری کے اس نظام میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کا میلان روپیہ جمع کرنے کی طرف ہو اور وہ اس کو صرف پیدا آور اغراض کے لیے استعمال کرنے کی سعی کریں۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کی جائیں، بنک کھولے جائیں، پراویڈنٹ فنڈ قائم ہوں۔ انشورنس کمپنیاں بنائی جائیں۔ امداد باہمی کی جمعیتیں تشکیل کی جائیں، اور ان تمام مختلف معاشی تدبیروں میں ایک ہی روح کام کرے، یعنی روپے سے زیادہ روپیہ پیدا کرنا، خواہ وہ تجارتی لین دین کے ذریعہ سے ہو، یا سود کے ذریعہ سے۔ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سود اور تجارتی لین دین کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہے اس لیے نظام سرمایہ داری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف خلط ملط ہو جاتے ہیں، بلکہ کاروبار کی ساخت میں ان کی حیثیت تانے بانے کی سی ہوتی ہے، تجارت کے لیے سود اور سود کے لیے تجارت لازم و ملزوم ہیں اور ان میں سے کسی کو دوسرے کے بغیر فروغ نہیں ہو سکتا۔ اگر سود نہ ہو تو سرمایہ داری کا تار و پود بکھر جائے۔

نظام اشتراکی سرمایہ داری کے عین مقابل ایک دوسرا نظام معیشت ہے جس کو اشتراکی نظام کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ تمام وسائل ثروت سوسائٹی کے درمیان مشترک ہیں، اس لیے افراد کو فرداً فرداً ان پر مالکانہ قبضہ کرنے اور اپنے حسب منشا ان میں تصرف کرنے، اور ان کے منافع

سے تنہا متمتع ہونے کا حق نہیں ہے اشخاص کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ ہوگا جو سوسائٹی کے مشترک مفاد کے لیے وہ انجام دیں گے۔ سوسائٹی ان کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرے گی اور وہ اس کے بدلہ میں کام کریں گے۔

یہ نظریہ ایک دوسرے ڈھنگ پر معیشت کی تنظیم کرتا ہے جو بنیادی طور پر نظام سرمایہ داری سے مختلف ہے۔ اس تنظیم میں سرے سے ملکیت شخصی ہی کا وجود نہیں پھر کہاں اس کی گنجایش کہ کوئی زر جمع کرے اور اس کو بطور خود کاروبار میں لگائے۔ یہاں چونکہ نظریے اور اصول میں اختلاف ہو گیا ہے اس لیے مناہج بھی بدل گئے ہیں۔ نظام سرمایہ داری کا کارخانہ بنکنگ انشورنس اشترکہا لے سہامی اور ایسے ہی دوسرے اداروں کے بغیر نہیں چل سکتا لیکن اشتراکیت کی ساخت اور اس کے معاشی معاملات میں نہ ان اداروں کی گنجائش ہے، نہ ضرورت۔ سرمایہ داری کے مزاج سے سود کو جتنی گہری مناسبت ہے، اشتراکیت کے مزاج سے اس کو اتنی ہی زیادہ شدید ناموافقت ہے۔ اشتراکیت اس چیز کی بنیاد ہی مسمار کر دیتی ہے جس کی بناء پر ایک شخص سود لیتا اور دوسرا شخص سود دیتا ہے۔ اس کے اصول کسی شکل اور کسی حیثیت میں بھی سود کو جائز نہیں رکھتے اور جو شخص ان اصولوں پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ بیک وقت اشتراکی بھی ہو اور سودی لین دین بھی کرے۔

اسلام کا معاشی نظام اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی ہے مگر اس کے اصول و نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت کے مشترک مفاد کی خدمت کے لیے آمادہ کرنے والی اور تا بحد ضرورت اس پر مجبور کرنے والی ہو، بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خود غرضانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے جس سے وہ اپنے شخصی مفاد کے لیے جماعت کے خلاف عملاً جنگ کرنے لگتے ہیں، اور سرمایہ داری کا نظام اس جنگ میں ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ تقسیم ثروت کا

توازن بالکل بگڑ جاتا ہے۔ ایک طرف چند افراد پوری جماعت کے وسائل ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں، اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ جاتا ہے۔ ابتداءً سرمایہ داروں کی دولت اپنے شاندار مظاہر سے تمدن میں ایک نظر فریب چمک دمک ضرور پیدا کر دیتی ہے، مگر دولت کی غیر متوازن تقسیم کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشی دنیا کے جسم میں دوران خون بند ہو جائے، جسم کے اکثر حصے قلت خون کی وجہ سے سوکھ کر تباہ ہوں، اور اعضاء رئیسہ کو خون کا غیر معمولی اجتماع تباہ کر دے۔

اشتراکیت اس خرابی کا علاج کرنا چاہتی ہے، مگر وہ ایک صحیح مقصد کے لیے غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصد تقسیم ثروت میں توازن قائم کرنا ہے اور یہ بلاشبہ صحیح مقصد ہے مگر اس کے لیے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو درحقیقت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا، نہ صرف معیشت کے لیے تباہ کن ہے، بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لیے مہلک ہے، کیونکہ یہ چیز معاشی کاروبار اور نظام تمدن سے اس کی روح رواں، اس کی اصلی قوتِ محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے، وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ وہ اپنے دل اور دماغ اور دست و بازو کی تمام طاقتیں اُس کام میں خرچ کر دیتا ہے جس سے اس کو خود اپنے مفاد کے لیے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر سرے سے دلچسپی ہی باقی نہ رہے، اور اس کو معلوم ہو کہ اس کے لیے فوائد و منافع کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس سے بڑھ کر وہ اپنی جد و جہد سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا، تو اس کے قوائے فکر و عمل ٹھٹھر کر

رہ جائیں گے، اور وہ محض ایک مزدور کی طرح کام کرے گا جس کو اپنے کام سے بقدر اجرت ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ تو اشتراکی نظام کا باطنی پہلو ہے۔ اس کا خارجی اور عملی پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار افراد کا خاتمہ کر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کو وجود میں لاتا ہے یعنی اشتراکی حکومت۔ یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی اس اقل قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح افراد سے خدمت لیتا ہے اور ایک مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسباب حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس کے پاس نہ ہمدردی ہے، نہ قدر و اعتراف۔ وہ انسانوں سے انسانوں کی طرح کام نہیں لیتا بلکہ مشین کے کل پرزوں کی طرح کام لیتا ہے، اور ان سے فکر و رائے اور عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کے بغیر نظام اشتراکی نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے کیونکہ افراد کی عین فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے۔ اگر ان کو دائماً استبداد کے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر نہ رکھا جائے تو وہ اشتراکی نظم کو دیکھتے دیکھتے منتشر کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس کی سوویٹ گورنمنٹ دنیا کی حکومتوں میں سب سے زیادہ مستبد اور جابر ہے۔ اس کا یہ جبر و استبداد کچھ اس وجہ سے نہیں کہ محض بخت و اتفاق نے اسٹالین جیسے ڈکٹیٹر کو پیدا کر دیا ہے، بلکہ درحقیقت اشتراکیت کا مزاج ہی ایک شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کا مقتضی ہے۔

اسلام ان دو متضاد معاشی نظاموں کے درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے پورے شخصی حقوق دیئے جائیں، اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی نہ بگڑنے دیا جائے۔ ایک طرف وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق دیتا ہے، اپنے مال میں تصرف کرنے کے اختیارات دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ ان سب حقوق اور اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں، اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی پابندیاں عائد کر دیتا

ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائل ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہیں، اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ مل سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے معیشت کی تنظیم ایک نئے ڈھنگ پر کی ہے جو اپنی روح اور اپنے اصولوں اور اپنے طریق کار کے اعتبار سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے مختلف ہے۔

آئیے اب ایک تفصیلی نظر انسانی معیشت کی اس الٰہی تنظیم پر بھی ڈال لیجیے۔

اسلام کے اصول معیشت | اسلام کا معاشی نظریہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ معاشی زندگی میں ہر ہر فرد کا شخصی مفاد اور تمام افراد کا اجتماعی مفاد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں میں مزاحمت کے بجائے موافقت اور معاونت ہونی چاہیے۔ فرد اگر اجتماعی مفاد کے خلاف جد و جہد کر کے جماعت کی دولت اپنے پاس سمیٹ لے، اور اس کو جمع رکھنے یا خرچ کرنے میں محض اپنے ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھے تو یہ صرف جماعت ہی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ مآل کار میں اس کے نقصانات خود اس شخص کی اپنی ذات کی طرف بھی عود کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر اجتماعی مفاد کے لیے افراد کے شخصی مفاد کو قربان کیا جائے تو اس میں صرف افراد ہی کا نقصان نہیں بلکہ مآل کار میں جماعت کا بھی نقصان ہے۔ پس فرد کی بہتری اس میں ہے کہ جماعت خوش حال ہو۔ اور جماعت کی بہتری اس میں ہے کہ افراد خوش حال ہوں، اور دونوں کی خوشحالی اس پر موقوف ہے کہ افراد میں خود غرضی اور ہمدردی کا صحیح تناسب قائم ہو، ہر شخص اپنے ذاتی فائدے کے لیے جد و جہد کرے۔ مگر اس طرح کی اس میں دوسروں کا نقصان نہ ہو، ہر شخص جتنا کما سکے کمائے مگر اس کی کمائی میں دوسروں کا بھی حق ہو، ہر شخص دوسروں سے خود بھی نفع حاصل کرے اور دوسروں کو نفع پہنچائے بھی۔ منافع کی اس تقسیم اور دولت کی اس گردش کو جاری رکھنے کے لیے محض افراد کے باطن میں چند اخلاقی اوصاف پیدا کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ جماعت کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیے جو مال کے اکتساب اور خرچ دونوں کی

صحیح تنظیم کردے۔ اس کے ماتحت کسی کو مضرت رساں طریقوں سے دولت کمانے کا حق نہ ہو، اور جو دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے وہ بھی ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے، بلکہ صرف ہو اور زیادہ سے زیادہ گردش کرے۔

اس نظریہ پر جس نظمِ معیشت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا مقصد نہ تو یہ ہے کہ چند افراد کروڑپتی بن جائیں اور باقی تمام لوگ فاقے کریں، اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی کروڑپتی نہ بن سکے اور جبراً سب کو ان کے فطری تفاوت کے باوجود ایک حال میں کر دیا جائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے بین بین اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد کی معاشی ضروریات پوری ہوں۔ اگر ہر شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی فطری حد کے اندر رہ کر اکتساب مال کی کوشش کرے اور پھر اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں کفایت شعاری اور امداد باہمی کو ملحوظ رکھے تو سوسائٹی میں وہ معاشی ناہمواری پیدا نہیں ہو سکتی جو سرمایہ داری کے نظام میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس قسم کا طرز معیشت کسی کو کروڑپتی ہونے سے نہیں روکتا، مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کروڑپتی کی دولت اُس کے ہزاروں ابنائے نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو۔ دوسری طرف یہ طرز معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتا ہے، مگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جن کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت اور قابلیت کے مطابق اکتساب مال نہ کر سکتا ہو۔

اسلامی نظمِ معیشت کے ارکان

یہ ہے اسلام کا معاشی نظریہ۔ اب دیکھئے کہ اس نظریہ کے مطابق اسلام نے جو نظمِ معیشت قائم کیا ہے، اس کے اخلاقی اور قانونی ارکان کیا ہیں:۔

(۱) اکتساب مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق۔ یہ تفریق اس قاعدہ کلیہ پر مبنی ہے کہ دولت کمانے کے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا

اشخاص کے نقصان پر ہو، اور ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد و منافع کا مبادلہ اشخاص متعلقہ کے درمیان باہمی رضامندی سے ہو۔ قرآن مجید میں اس قاعدۂ کلیہ کو اسطرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا (۴: ۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو، بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو، اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کرکے ظلم کیساتھ ایسا کریگا اس کو ہم آگ میں جھونک دینگے

اس آیت میں لین دین کے لیے جواز کی دو شرطیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو۔ دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ اس معنی میں ولا تقتلوا انفسکم کا فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کا نقصان کرتا ہے وہ گویا اس کا خون پیتا ہے اور مآل کار میں خود اپنی تباہی کا راستہ کھولتا ہے۔ چوری، رشوت، قمار، دغا و فریب، سود، اور بہت سے بیع کے طریقوں میں، عدم جواز کے یہ دونوں اسباب پائے جاتے ہیں، اور اگر بعض میں تراضی کے وہم کی گنجائش بھی ہے تو لا تقتلوا انفسکم کی دوسری اہم شرط مفقود ہے۔

(۲) جائز طریقوں سے جو دولت کمائی جائے اس کو جمع نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے، اور تقسیم دولت میں توازن برقرار نہیں رہتا۔ دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرنے والا نہ صرف خود بدترین اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ پوری جماعت کے خلاف ایک شدید جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ آخر کار خود اس کے لیے بھی برا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید بخل اور قارونیت کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ جو لوگ اللہ کے دئے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ

مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۚ (۳:۱۸۰) گمان نہ کریں کہ یہ فعل ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے لیے برا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹:۵)۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر دیدو۔

یہ چیز سرمایہ داری کی بنیاد پر ضرب لگاتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ داری کا دروازہ ہی بند کرنا مقصود ہے تو سود جو بخل اور جمع مال کا ثمرہ ہے، اسلام کے نظم معیشت میں کیسے بار پا سکتا ہے۔

(۳) جمع کرنے کے بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے، مگر خرچ کرنے سے اس کا یہ مقصد نہیں کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے یعنی آپ کے پاس آپ کی اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے اس کو نیک اور مفید کاموں میں خرچ کر دیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

وَيَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (۲:۲۸) اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ (۴:۶) احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور نادار مسکینوں اور قرابتدار پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور اپنے لونڈی غلاموں پر۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱:۱) اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔

اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار سمجھتا ہے

کہ خرچ کرنے سے مفلس ہوجاؤں گا اور جمع کرنے سے مالدار بنوں گا۔ اسلام کہتا ہے خرچ کرنے سے برکت ہوگی، تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ اور بڑھے گی۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا۔ (۲: ۲۶۸)

شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرمناک بات کا حکم دیتا ہے مگر اللہ تم سے اپنی بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو خرچ کردیا وہ کھو یا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمہاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ۔ (۲: ۲۷۲)

تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کروگے وہ تم کو پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ (۳۵: ۳۰)۔

اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے اللہ ان کے بدل ان کو پورے پورے اجر دیگا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ عنایت کرے گا۔

(باقی)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ معظم سٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)